MONTHLY AWAMI JAMHURIAT
LAHORE
ماہنامہ
عوامی جمہوریت
لاہور
اکتوبر 2010ء

بیرونی قرضوں سے نجات،
عوامی اُمنگوں پر استوار معیشت اور سچے جمہوری ڈھانچے کا قیام
سماجی تبدیلی کیلئے محنت کشوں کی جدوجہد سے جڑا ہوا ہے

تعزیتی اجلاس کے شرکاء

تصادم، محاذ آرائی اور جمہوریت

منتخب حکومت کے قیام اور بظاہر جمہوری عہد کے آغاز کو اب تیس 30 ماہ زائد کا عرصہ ہو چکا ہے۔۔۔۔۔ یہ سارا وقت کسی نہ کسی سطح پر محاذ آرائی اور کشمکش سے آزاد نہیں رہا۔ بعض اوقات اس محاذ آرائی کے نتیجے میں یہ افواہیں گردش کرنے لگیں کہ 'جمہوریت' کی بساط ہی لپیٹی جانے والی ہے۔ گویا پونے تین سال مسلسل بحرانوں اور ہیجانی صورت حال کا شکار رہے ہیں۔۔۔۔۔ یہ بے حد افسوسناک صورتحال ہے۔۔۔۔۔ خاص بات یہ ہے کہ محاذ آرائی، کشمکش اور بے اعتمادی یہ تمام عمل بالائی سطح پر اداروں کے درمیان جاری ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ پاکستان کے عام لوگ اور محنت کرنے والے طبقات جو ملکی آبادی کا غالب حصہ ہیں اس محاذ آرائی میں شامل ہوں حالانکہ معاشی، سماجی، علاقائی استحصال کے پاکستانی معاشرے میں محاذ آرائی کا حق انہی طبقات کو حاصل ہونا چاہیے تھا۔۔۔۔۔ یہاں محاذ آرائی اداراتی (Institutional) ہے۔

ہر نظام حکومت اپنے ادارے وضع کرتا ہے اور انہی کے ذریعے حکومت کا نظم ونسق چلتا ہے۔ یورپ میں بادشاہوں، کلیسا اور جاگیرداروں کے نظام جبر کیخلاف بغاوتوں اور چھوٹے بڑے انقلابات کی ایک لمبی تاریخ تین چار سو برسوں پر محیط ہے (تیرہویں 13، چودھویں 14 صدی سے سترہویں، اٹھارویں صدی تک) اسی دوران سائنسی ایجادات کا آغاز ہوا، دستکار، تاجر اور صنعتی سرمایہ دار، طبقہ اُبھر کر سامنے آئے اور بالآخر سرمایہ دارانہ نظام قائم ہوا۔ اسی معاشی تبدیلی کا سیاسی نظام جمہوریت قرار پایا۔۔۔۔۔ جمہوری نظام سیاست کی ترویج اور استحکام کا عمل بھی نشیب وفراز سے گذرا، قتل وغارت، جنگ وجدل، مذہبی تشدد۔۔۔۔۔ تاریخ عالم نے یہ سب کچھ دیکھا۔۔۔۔۔ بہرحال ترقی یافتہ صنعتی سرمایہ دار ملکوں میں جمہوریتیں قائم ہوئیں۔ ان کی شکل کہیں پارلیمانی تھی (برطانیہ) کہیں صدارتی (امریکہ) اور کہیں دونوں کا امتزاج (فرانس)۔۔۔۔۔ بہرحال جمہوریت کا بنیادی عنصر عوام کا حقِ نمائندگی اور اسکی بنیاد پر منتخب حکومت کا قیام تھا اور اسکے ساتھ ہی سوچ اور اظہار کی آزادی، سیاسی عمل اور انجمن سازی کی آزادی وغیرہ کے بنیادی حقوق تسلیم ہونے لگے۔۔۔۔۔ تاہم یہ سب سرمایہ دارانہ معیشت ہی کی بنیاد پر قائم ہوئی۔۔۔۔۔ سرمایہ داری نظام جو منافع اور سرمائے کے پھیلاؤ اور انسانی محنت کے بیدریغ استعمال کا نظام ہے، مسلسل اندرونی تضادات کا شکار ہوا، تو انیسویں 19 صدی کے یورپ نے محنت کشوں کی تحریکوں اور ایک متبادل انصاف پسند نظام کے حصول کی جدوجہد کو جنم دیا۔ کارل مارکس اور فریڈرک اینگلز کی نظریاتی اور عملی قیادت نے سوشلزم کا سائنٹفک نظریہ پیش کیا اور کمیونسٹ مینی فیسٹو تحریر کیا۔۔۔۔۔ اکتوبر 1917ء کا انقلاب روس اسی متبادل نظام کی تلاش کا عملی نتیجہ ہے۔۔۔۔۔ یہ اسی انقلاب کی دین تھی کہ دنیا بھر کی محکوم اقوام نے جو سرمایہ دارانہ توسیع پسندی کے نو آبادیاتی اور سامراجی غلبے کے خلاف جدوجہد کر رہی تھیں، اپنی جدوجہد کو تیز تر کر دیا اور رفتہ رفتہ آزادیاں حاصل کیں۔

برصغیر کی آزادی اور پاکستان کے قیام کے وقت (1947)ء دونوں ملکوں کی سیاسی قیادت یہاں کے مراعات یافتہ طبقات پر مشتمل تھی، البتہ فرق یہ تھا کہ ہندوستانی لیڈر شپ اور اسکی پارٹی یعنی کانگرس اپنے ساتھ ایک لمبی سامراجی مخالف جمہوری جدوجہد کی تاریخ لیکر برسر اقتدار آئی تھی اور دوسرے یہ کہ ہندوستان بنیادی طور پر زرعی معیشت کا ملک ہونے کے باوجود، برلا، ٹاٹا، اور کئی دوسرے صنعتی اور تاجر عناصر کا ملک تھا جو کانگرس کے پشت پناہ تھے، چنانچہ ہندوستان کو ایک جمہوری آئین 1949ء بنانے میں زیادہ دقت نہیں ہوئی، اچھی یا بری زرعی اصلاحات بھی ہوگئیں اور ایک پارلیمانی جمہوری حکومت قائم ودائم ہوگئی۔۔۔۔۔ پاکستان میں قائد اعظم جیسے چند رہنماؤں کو چھوڑ کر سبھی مسلم لیگی لیڈر (خاص کر مغربی پاکستان میں) جاگیرداری طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور حقیقتاً یہی لوگ طاقت ور تھے۔ ان کا کسی لمبی جمہوری جدوجہد سے دور کا بھی تعلق نہ تھا، ہمارے ملک میں آزادی کے بعد کی تاریخ اسی طبقے کی مفاد پرستی اور فوج اور نوکر شاہی کے بڑھتے ہوئے اثر اور ان دونوں کے گٹھ جوڑ کی داستان ہے۔

اس صورتحال کو امریکہ سے فوجی وابستگی اور اس پر معاشی انحصار نے اور بھی پیچیدہ بنا دیا۔۔۔۔۔ چنانچہ پاکستان میں جمہوریت کی کوئی روایت پیدا نہیں ہوئی۔ سالہا سال تک آئین نہیں بنا، انتخابات نہیں ہوئے نہ ادارے تشکیل پائے نہ جمہوری اداروں کی اہمیت کا کوئی تصور پیدا ہوا۔

اس تکلیف دہ تاریخ کے باوجود جب بھی منتخب اداروں نے آئین بنایا اسکی بنیاد انہی اصولوں پر رکھی گئیں جو بین الاقوامی طور پر طے شدہ جمہوری آئینوں کی بنیاد ہوتے ہیں، سوائے اس کے کہ 1956ء (پہلے آئین) اور 1973 (دوسرے آئین) کے موقع پر مذہبی حوالوں کو بھی آئین میں جگہ دی گئی۔۔۔۔۔ 1973ء کا آئین واضح طور پر وفاقی اور پارلیمانی نظام کی تشکیل کرتا ہے۔۔۔۔۔ 'وفاقیت' ریاست کے تمام یونٹوں کے حقوق کے تحفظ کو تسلیم کرنے کا نام ہے۔ یہ جمہوریت کا بنیادی تقاضہ ہے۔۔۔۔۔ پارلیمانی نظام میں منتخب نمائندوں پر مشتمل پارلیمان کو ملک کا بااختیار قانون ساز ادارہ مانا جاتا ہے اور اسی ادارے سے منتخب حکومت کا قیام ہوتا ہے جسے انتظامیہ کہتے ہیں، انتظامیہ کا سربراہ وزیر اعظم ہوتا ہے۔۔۔۔۔ پارلیمان قانون بناتی ہے اور انتظامیہ اس قانون پر عمل درآمد کرواتی ہے [جس کے لئے سرکاری محکمے بنائے جاتے ہیں] یہ دونوں ادارے اپنے اختیارات آئین اور قانون کے دائرے میں استعمال کرتے ہیں۔۔۔۔۔ اور اگر یہ سوال پیدا ہو جائے کہ پارلیمان کا بنایا ہوا قانون یا انتظامیہ کے احکامات آئین اور قانون کے دائرے میں ہیں یا اس سے تجاوز کرتے ہیں تو اس کا فیصلہ ایک تیسرا ادارہ یعنی عدلیہ کرتا ہے۔ اسی لئے عدلیہ کی آزادی پر زور دیا جاتا ہے تاکہ وہ انتظامیہ کے اثر سے آزاد ہو کر آئین اور قانون کی تشریح کرے اور اگر ضروری ہو تو مقنّنہ کے بنائے ہوئے قانون اور حکومت کے انتظامی احکامات کو آئین، بنیادی حقوق اور مسلمہ قانونی اصولوں سے ماوراء قرار دے کر کالعدم قرار دیدے۔۔۔۔۔ اسی کا نام چیک اینڈ بیلنس [check and balance] کا نظام ہے اور یہ جمہوریت کا اہم تقاضہ ہے۔۔۔۔۔ تاہم پاکستان میں چیک اینڈ بیلنس کی جگہ ''بالادستی'' کا زیادہ ذکر ہوتا ہے۔ آئے روز یہ قضیہ پیدا ہو جاتا ہے کہ پارلیمان بالادست ہے یا عدلیہ۔ اداراتی تنازعات کی ایک بڑی وجہ یہ معاملہ ہے۔۔۔۔۔ حالانکہ ایک تحریر شدہ آئین جس پر عموماً اتفاق رائے ہے، ہی بالادستی کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ تمام ادارے اسی آئین کی تخلیق ہیں اور اسی کے دائرے کے اندر رہ کر اپنے اختیارات استعمال کرنے کے مجاز ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پارلیمان ایک منتخب ادارے کی حیثیت سے رائے عامہ کی نمائندگی کرتی ہے اور اس کی بنیاد پر

قانون سازی [بشمول آئین میں ترمیم کرنے کے] کا اختیار رکھتی ہے۔۔۔۔۔تاہم آئین ہی کی منشا کے مطابق قوانین کی تشریح اور انکی آئینی حیثیت کی جانچ پرکھ عدلیہ ہی کا اختیار ہے۔۔۔۔۔ انتظامیہ بہرحال قانون کے مطابق کام کرنے کی پابند ہے اور قانون کی اس تشریح کی بھی پابند ہے جو عدلیہ کرتی ہے۔عدلیہ کے فیصلے آئین کی رو سے تمام حکومتی افراد اور ادارے کو تسلیم کرنا ہوتے ہیں [دفعہ 190]۔۔۔۔جب مسئلہ بالادستی کا اٹھایا جائے یا انتظامیہ عدلیہ کے بعض فیصلوں کو ماننے سے انکار کر دے تو تنازع پیدا ہوتا ہے جو اداراتی تصادم کی شکل اختیار کر لے لازم ہے۔۔۔۔اس تصادم سے جمہوریت، قانون کی عملداری [یعنی rule of law] جو جمہوریت کا بنیادی عنصر ہے اور ریاست کا نظام تہ و بالا ہو جاتا ہے۔خود سرمایہ دارانہ نظام اس بحران کا متحمل نہیں ہوسکتا۔۔۔۔۔سرمایہ دارانہ جمہوریت کی بنیادی ریاستی نظام کو آئین کے مطابق چلانے ہی پر ہے۔یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ اگر عدالتی فیصلہ آئین کے مطابق نہ ہو تو کیا انتظامیہ پھر بھی اس کی پابند ہے؟ تو اس کا سادہ جواب یہ ہے کہ یقیناً ایسا ہی ہے تآنکہ فیصلہ تبدیل نہ ہو، انتظامیہ کی حیثیت اس بارے میں وہی ہے جو عام لوگوں کی ہے۔۔۔۔۔حکومتوں کے فیصلے پارلیمان کے بنائے ہوئے قوانین، حتیٰ کہ بعض اوقات عدالتی فیصلے بھی عوام کی منشا اور خواہشات سے متصادم ہوتے ہیں۔عوام کو سیاسی سطح پر ان سب کے خلاف آواز بلند کرنے اور جدوجہد کا حق ہے۔۔۔۔۔یہ جمہوری حق ہی بعض اوقات انقلابی لہر کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

بائیں بازو کے بعض عناصر یہ سوال بھی اٹھاتے ہیں کہ اگر جمہوریت کی تخلیق ہی سرمایہ دارانہ عہد میں ہوئی اور اسی لئے اسے بورژوا جمہوریت کا نام دیا جاتا ہے تو ہم اس کے لئے پریشان کیوں ہیں۔۔۔۔۔یہ تو درست ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں جمہوریت اسی معاشی نظام کی گرفت میں رہتی ہے، اسی لئے بائیں بازو اور محنت کش عوام کی جدوجہد سرمایہ دارانہ [یا جاگیردارانہ] نظام کی گرفت سے آزادی حاصل کرنے پر مرکوز ہوتی ہے، تاہم اپنی اس جدوجہد میں وہ ان تمام حقوق کو بروئے کار لاتے ہیں جو آئین، بنیادی انسانی حقوق اور مروجہ جمہوری ضابطوں نے انہیں دیئے ہیں۔۔۔۔۔مزید یہ کہ جمہوریت کے بنیادی اصول، یعنی نمائندگی کا حق، آزادئ خیال، آزادئ اظہار، انجمن سازی کا حق اور حکومت سازی کا حق اب ایسے اصول ہیں جو صرف سرمایہ داری نظام کی خصوصیت نہیں ہیں۔طبقاتی بالادستی کے خاتمے، عوامی حاکمیت اور مشترکہ ملکیت کا کوئی بھی نظام اب بنیادی جمہوری اصولوں کو نظرانداز نہیں کرسکتا۔۔۔۔۔دنیا میں 70 ستر برس تک قائم رہنے والے سوشلسٹ نظام نے جہاں انسانی فلاح اور ترقی کے کئی تاریخی کارنامے رقم کئے ہیں، وہاں یہ تجربہ بھی آنے والی نسلوں کے نام چھوڑا ہے کہ عوام کی جمہوری قوت ہی بالآخر تاریخ کے تسلسل کو قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے۔اس قوت کا فقدان بھی سوویٹ یونین کے اندرونی خلفشار اور شکست وریخت کی ایک وجہ تھی۔۔۔۔۔

بہرحال پاکستان کا مسئلہ، بشمول یہاں کے محنت کشوں اور بائیں بازو کے، اس وقت یہ ہے کہ ریاست آئین کی پابندی کرے، اداراتی تصادم کا خاتمہ ہو اور مفادات کے بھنور سے نکل کر جمہوری سیاست کی بازیافت کی جائے۔۔۔۔۔محنت کشوں کے حقوق کی جدوجہد اور سماجی تبدیلی کی کسی بھی بڑی تحریک کا پھیلنا مفاد پرست اشرافیہ کے پیدا کردہ موجودہ بحرانوں سے آزاد ریاست کی تشکیل اور جمہوری جدوجہد سے جڑا ہوا ہے۔

خون کی ہولی اور روشنیوں کا شہر

کراچی جو ڈیڑھ کروڑ سے زائد آبادی کا شہر ہے، صنعت اور تجارت کا مرکز بھی ہے اور مختلف قومیتوں اور لسانی آبادی کا مسکن بھی.....تاہم وہ بنیادی طور پر سندھ کا شہر ہے۔۔۔۔۔یہ کل تک روشنیوں کا شہر کہلاتا تھا، پھر کہا گیا کہ یہاں طالبانائزیشن ہو رہی ہے اور مذہبی اور فرقہ وارانہ دہشت گردی سے قتل وغارتگری کا بازار گرم ہوا۔۔۔۔۔اور اب کئی ماہ سے ٹارگٹ کلنگ کے نام پر سینکڑوں انسان قتل کر دیئے گئے ہیں۔۔۔۔۔اور یہ سلسلہ جاری ہے۔شہری زندگی مفلوج ہو کر رہ گئی ہے، کاروبار متاثر ہیں، روزگار کمانے والے، دیہاڑی دار اور دوسرے ہراساں ہیں۔۔۔۔۔اور انتظامیہ بے بس نظر آتی ہے۔

سندھ میں حکومت پاکستان پیپلز پارٹی، متحدہ قومی موومنٹ اور عوامی نیشنل پارٹی کے اشتراک سے قائم ہے۔۔۔۔۔یہ تینوں کراچی کی صورتحال کی ذمہ داری ایک دوسرے پر ڈال رہے ہیں۔۔۔۔ایم کیو ایم جو کراچی میں اپنی بالادستی پر نازاں تھی (اور جسکا مظاہرہ ان نوے ہزار ووٹوں سے ہوا ہے جو کل ہی اُسے انتخاب میں حاصل ہوئے ہیں)، جسکی تنظیمی طاقت ہمہ گیر ہے جس نے پورے شہر کو سیکٹروں میں تقسیم کر رکھا اور نظم ونسق کی بھی ذمہ دار ہے مگر کراچی کی موجودہ قتل وغارت گری اور لوٹ مار کی صورت حال سے اپنے آپ کو الگ کرنا چاہتی ہے جبکہ دوسرے اسے اسکا ذمہ دار قرار دیتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ کراچی ایک سونے کی چڑیا ہے، تمام مین سٹریم سیاسی گروہ اسکو اپنے اپنے قابو میں کرنا چاہتے ہیں اور وہ جن کے قبضے میں یہ سالہا سال سے رہی ہے وہ اپنی گرفت کو ڈھیلا ہوتے نہیں دیکھ سکتے۔۔۔۔۔زمین کا قبضہ، بھتہ، ڈرگ اور اسلحے کا کاروبار اس سب نے مافیا کو جنم دیا ہے۔۔۔۔یہ مافیا سیاسی پارٹیوں سے آزاد بھی ہے اور ان سے جُڑا بھی ہوا ہے۔مگر دوسری جانب کراچی شہر کے لیاری گینگ وار کے گروپوں نے امن کمیٹی کے نام پر تنظیمیں بنا رکھی ہیں جو اس سارے کاروبار میں ملوث ہیں اور ان پر الزام ہے کہ ان کو وزیر داخلہ کی سرپرستی حاصل ہے اسطرح شہر کے اندر زمین کا قبضہ مافیا، ڈرگ اور اسلحہ مافیہ بھی اس کاروبار میں ملوث ہے جس کی سرپرستی کا الزام تنگ نظر قوم پرستوں اور اے این پی کے علاوہ مذہبی انتہا پسند گروپوں پر بھی ہے۔یہ عناصر شہر میں بدامنی، قتل وغارت دہشت گردی اور لوٹ مار کے ذمہ دار ہیں۔

خون عوام کا بہہ رہا ہے۔محنت کش اور غریب انسان اس صورتحال سے سب سے زیادہ متاثر ہیں۔

اس صورتحال کا خاتمہ ضروری۔حکومت مرکز کی ہو یا صوبے کی یا باثر پارٹیاں ہوں کراچی کے امن کی ذمہ داری ان سب پر عائد ہوتی ہے اور ستم یہ ہے کہ متعلقہ سیاسی جماعتوں اور گروپوں کی امن قائم کرنے کے لئے سیاسی کمٹمنٹ نظر نہیں آرہی ہے تاریخ ان میں سے کسی کو بھی معاف نہیں کریگی۔

☆☆☆☆☆

''سرخ مولانا'' ۔ مولانا آزاد سبحانی

مسلم شمیم

معروف ہندوستانی کمیونسٹ راہنما اور مارکسی نظریہ داں ڈاکٹر ادھیکاری نے مولانا آزاد سبحانی کی زندگی اور ان کے سیاسی کردار کے حوالے سے انگریزی زبان میں ایک کتاب لکھی تھی جس کا ''سرخ مولانا'' کے نام سے اردو میں ترجمہ ہوا تھا اور سیاسی حلقوں میں اسے ایک اہم تحریر قرار دیا گیا تھا۔ مولانا آزاد سبحانی کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے بانیوں میں سے تھے۔ 1925ء میں جب کانپور میں کمیونسٹ پارٹی کی تشکیل کے لئے تاسیسی اجلاس منعقد ہوا تھا، وہ اس کے تنظیمی کمیٹی کے وائس چیئرمین اور حسرت موہانی اس کے چیئرمین تھے۔ اس تناظر میں مولانا آزاد سبحانی کا ذکرِ خیر اور ان کے کارناموں کا حوالہ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی تاریخ میں عزت و تکریم کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ مولانا آزاد سبحانی تحریکِ آزادی کے جس پائے کے راہنما تھے، اس کا شہرہ اس طرح نہیں ہوا جس کا وہ استحقاق رکھتے تھے۔ اس کے بہت سے اسباب ہو سکتے ہیں۔ ان کی سیاست روشِ عام سے ہٹ کر تھی وہ نہ تو انڈین نیشنل کانگریس میں سرگرم رہے اور نہ مسلم لیگ کی سیاست سے کبھی وابستہ رہے۔ وہ بنیادی طور پر ایک مفکر اور فلسفی تھے مگر زندگی کا بیشتر حصہ ایک عالمِ باعمل کی حیثیت سے بڑا متحرک اور سیاسی طور پر فعال گزارا۔ روشِ عام سے ہٹ کر وہ جداگانہ قدر و قیمت کے حامل تھے۔ وہ ہر اعتبار سے ایک انقلابی مفکر اور انقلابی سیاسی قائد تھے۔

ممتاز دانش ور اور ترقی پسند قلم کار جناب خلیق ابراہیم خلیقؔ نے اپنی معرکتہ الآراء کتاب 'منزلیں گرد کے مانند' میں مولانا آزاد سبحانی کا اجمالی تذکرہ اپنی ذاتی یادوں کے حوالے سے کیا جو اپنی جگہ بڑی وقیع اور جامعیت کا حامل ہے۔ انھوں نے اپنے تاثراتی اندازِ بیاں میں یہ لکھا ہے:

''انھیں (مولانا آزاد سبحانی) بچپن میں دیکھ چکا تھا جب وہ میرے دادا سے ملنے آتے تھے، لیکن ظاہر ہے اُس وقت مجھے اِتنا شعور نہیں تھا کہ میں اُن کی باتیں سنتا اور اُن کے مقام اور مرتبے کو جاننے کی کوشش کرتا۔ مجھ پر اُن کے جوہر اُس شام کو جوشؔ صاحب کے ہاں کھلے جب وہ فلسفہ الٰہیات کی روشنی میں اپنی 'تحریکِ ربانی' کے اصول وضوابط کی تشریح کر رہے تھے۔ اُن کی عالمانہ گفتگو میں فلسفیانہ موشگافیاں بھی تھیں اور بذلہ سنجی کی چاشنی بھی، عام فہم اور دل کش بھی۔ اُس زمانے میں وہ 'تحریک ربانی' کے نام سے ایک دینی، سیاسی اور سماجی تحریک چلا رہے تھے جس کا منشور جوشؔ نے 'کلیم' میں شائع کیا تھا۔ اِس تحریک کا مقصد اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کی بنیادوں پر ہر نوع کے استحصال سے پاک ایسے معاشرے کی تشکیل وتعمیل کرنا تھا جس میں کسی بھی امتیاز کے بغیر ہر انسان کو اُس کی بنیادی ضرورتوں کی فراہمی کے ساتھ ساتھ مادی اور روحانی ترقی کے یکساں مواقع حاصل ہوں۔ آج کل کی اصطلاح میں ہم اِسے اسلامی جمہوری اشتراکی معاشرہ کہہ سکتے ہیں''۔

اُن کے نقطہ نظر کے مطابق کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا واحد پارٹی تھی جو حقیقی معنوں میں سیکولر جماعت تھی جس کے اشتراکی جمہوری ایجنڈا ھندوستان کی پوری مسلم آبادی کو اجتماعی طور پر کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا میں شامل ھوجانا چاھیے

جن خیالات اور تاثرات کا اظہار اپنے مذکورہ بیان میں جناب خلیق ابراہیم خلیقؔ نے کیا ہے اُنھیں پڑھ کر میری وہ روشن یادیں روشن تر ہو گئیں جو مجھے مولانا آزاد سبحانی کی متعدد صحبتوں میں بیٹھنے اور کسب فیض کرنے سے عبارت ہیں۔

مولانا آزاد سبحانی کے حوالے سے اپنی یادوں کے نقوش سپردِ قلم کرنے سے قبل میرا یہ بیان کرنا معنویت کا حامل ہے کہ میری یادوں کا تعلق ۱۹۴۹ء کے بعد کے چند سالوں سے ہے یعنی ۱۹۵۰ء کی دہائی کے ابتدائی حصے سے۔ یہ وہ دور تھا جب مولانا آزاد سبحانی اپنی ''تحریک ربانی'' کے ساتھ ساتھ ایک ذیلی تحریک چلا رہے تھے اور وہ تحریک اس زاویہ فکر سے وابستہ ہے۔ اُن کی رائے میں انڈین نیشنل کانگرس جس کا منشور سیکولرازم تھا مگر وہ سمجھتے تھے کہ کانگرس کا سیکولرازم محض دکھاوا تھا اور اُس سیکولرازم پر تکیہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اُن کے نقطہ نظر کے مطابق کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا واحد پارٹی تھی جو حقیقی معنوں میں سیکولر جماعت تھی جس کے اشتراکی جمہوری ایجنڈا ہندوستان کی پوری مسلم آبادی کو اجتماعی طور پر کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا میں شامل ہو جانا چاہیے۔ اُنھوں نے یہ تحریک آزادی کے فوراً بعد شروع کر دی تھی اور ہندوستان کے طول وعرض پر واقع شہروں اور قصبوں کا دورہ کر کے اپنا پیغام بڑے بڑے اجتماعات کا انعقاد کر کے پہنچاتے تھے اور جب تک زندہ رہے، یعنی ۱۹۵۷ء تک وہ جدوجہدِ آزادی کے راہنماؤں میں شامل رہے۔ بقول جناب خلیق ابراہیم خلیق کے ایک زمانہ تھا کہ برصغیر کے مسلم عوام میں اُنھیں وہی مقبولیت حاصل تھی جو علی برادران، حکیم اجمل خان ڈاکٹر انصاری، مولانا ابو الکلام آزاد، مولانا حسرت موہانی اور مولانا ظفر علی خان کو حاصل تھی۔ کلکتہ میں عید اور بقرہ عید کے مواقع پر شہر کے جو سب سے بڑے اجتماعات ہوئے تھے، اُن میں نماز کی امامت مولانا ابو الکلام آزاد کیا کرتے تھے اور اُن کے خطبات عید تاریخی اہمیت کے حامل ہوا کرتے تھے۔ سیاسی اختلافات کے باعث مولانا ابو الکلام آزاد کو اس فرض سے سبک دوش ہونا پڑا تو اُن کی جگہ دو سال تک نماز عیدین کی امامت اور خطابات کے فرائض مولانا آزاد سبحانی نے انجام دیے۔

مولانا آزاد سبحانی کی خطابت اور جادو بیانی کا یہ عالم تھا کہ ایک مجمع کثیر نماز عشا کے بعد اُن کی تقریر سننے کے لیے جمع ہوتا اور گھنٹوں ہمہ تن گوش اور اُن کی جادو بیانی کے سحر میں مبتلا رہتا۔ میں نے اُنھیں ایسے کئی اجتماعات میں جو صوبہ بہار کے دارالخلافہ پٹنہ میں منعقد ہوتے تھے سنا تھا۔ پٹنہ یعنی پراچین

ہندوستان میں جو پاٹلی پترا کے نام سے جانا جاتا تھا جو دہلی سے پہلے پورے برصغیر کا دارالخلافہ ہونے کا شرف رکھتا تھا، جسے عہد مغلیہ میں عظیم آباد کا نام دیا تھا اور برطانوی دور حکومت میں پٹنہ، مذکورہ خطابات کا موضوع خاص مشن ہوتا یعنی مسلم آبادی کو قائل کرنا کہ اشتراکیت کا اسلام سے کوئی ٹکراؤ نہیں اور یہ کہ اشتراکی نظام میں ضمیر کی مکمل آزادی کی ضمانت ہوگی، لہٰذا مسلمانوں کو اُن گم راہ کن پروپیگنڈوں کو مسترد کر دینا چاہیے جو مذہبی جماعتیں اِس باب میں پھیلاتی رہتی ہیں خصوصیت کے ساتھ جماعت اِسلامی کا اس ضمن میں کلیدی کردار ہے۔ اُن کا یہ بھی کہنا تھا کہ اشتراکیت کی مخالفت دراصل برطانوی نوآبادیاتی مفادات کے محافظین کا ایجنڈا ہے، یہی وجہ ہے کہ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا جو واحد حریت پسند جماعت تھی، اُسے روزِ اول سے غیر قانونی قرار دے دیا گیا اور اُس سے وابستہ رہ نماؤں اور کارندوں کو قید وبند کی صعوبتوں سے دوچار رکھا گیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ اشتراکیت کا چرچا عام تھا جس سے برطانوی نوآبادی کی تحریک جس کی قیادت انڈین نیشنل کانگرس کر رہی تھی، وہ سرے سے آزادی کی تحریک تھی ہی نہیں ۔ ۱۸۸۵ء میں میں ریٹائرڈ برطانوی بیوروکریٹ اکزنٹ ہیوم نے برطانوی حکومت کی حکمت عملی کے تحت انڈین نیشنل کانگرس قائم کی تھی اور یہ جماعت روزِ اول سے ۱۹۴۲ء تک برطانوی حکومت کی ہدایت اور رہ نمائی میں چلتی رہی۔ ۱۹۱۴ء میں مہاتما گاندھی کو جنوبی افریقا سے بلایا بلکہ لایا گیا تھا جہاں وہ بیس برس سے برطانوی مفادات کیلئے مصروف عمل تھے اور اُن کا Living Legend کا Image بنایا گیا ۔مہاتما گاندھی کی ہندوستان آمد سے نام نہاد آزادی کی تحریک کلیتہً برطانوی حکمت عملی کے تابع ہوگئی اور ماتما گاندھی اُس کے Supreme Leader بن گئے اور کانگرس کا جمہوری کردار مکمل طور پر تباہ ہوگیا اور مہاتما گاندھی نے اپنی مذہبیت اور رجعت پرستی کے رنگ میں کانگرس کو رنگ کر اُس کے سیکولر کردار کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ مولانا آزاد سبحانی کا کہنا تھا کہ کانگرس نے آزادی حاصل کرنے کا مطالبہ اور نعرہ ۱۹۳۰ء کی دہائی میں بادل ناخواستہ اپنایا، وہ بھی شہید بھگت سنگھ اور اُس کے ساتھیوں کی قربانی کے دباؤ کے تحت گاندھی ۔اروِن معاہدہ Gandhi - Irwin Pact دراصل بھگت سنگھ کے خون سے تحریر ہوا تھا۔ گاندھی جی کمیونسٹ دشمن نظریات کے زبردست حامی تھے اور اُن کا عدم تشدد Non Violence کا فلسفہ دراصل کمیونسٹ دشمنی پر استوار تھا۔ جب سے اُنھوں نے کانگرس کی قیادت سنبھالی، عدم تشدد اور ستیہ گرہ کے نام آزادی کی تحریک کو برطانوی مفادات کے تحفظ کی تحریک بنائے رکھا اور جو بھی تحریک اُنھوں نے چلائی، اُس تحریک سے عوام کو دور رکھا ۱۹۲۱ء کی عدم تعاون Non Cooperation کی تحریک نے جب زور پکڑا اور عوام کا سیلاب اُس میں امنڈنے لگا تو اُنھوں نے چوراچوری کی خوں ریزی کا سہارا لے کر اُس عظیم عوامی تحریک کو بغیر کسی مشورہ کیے بلکہ کانگرس کی مجلس عاملہ سے بھی رجوع کیے بغیر Call off کر لیا اور پورے ہندوستان اور ہندوستانی عوام کو غیر معمولی صدمات سے دوچار کر دیا اور عوام کو اندھیروں کے گرداب میں پھنس جانے کا احساس ہوا۔ یہ تحریک اگر روکی نہ گئی ہوتی تو اس کا عوامی کردار اجاگر ہوتا اور ہندوستان کو معکوس کا شکار ہوئی اور وقت گزرنے کے ساتھ مہاتما گاندھی کی مذہب پرستی مختلف انداز سے ہندوستانی سیاست میں داخل ہوتی گئی۔ بلکہ ہندوستانی سیاست کو آلودہ کرتی گئی اور کانگریس کا نام نہاد سیکولر ایجنڈا فرقہ پرستی کی دھند میں گم ہوتا گیا۔ 1925ء میں ویر ساور کر کی تنظیم راشٹریہ سوئم سنگھ (RSS) کا فلسفہ اور نظریہ افقِ سیاست پر ابھرتا گیا اور پنڈت جواہر لال نہرو کا سیکولر ہندوستان مہا سبھا، جن سنگھ اور بھارتی جنتا پارٹی کے پرچموں تلے آتا گیا۔ 1980ء میں چار نشستیں حاصل کرنے والی جماعت BJP ایک عشرے بعد ایوانِ اقتدار میں پہنچ گئی اور اس وقت بھی حزبِ اختلاف کی سب سے بڑی جماعت ہے۔ یہاں یہ کہنا بے محل نہیں ہوگا کہ ہندوستان کے عوام کی بھاری اکثریت سیکولر آدرش کی حامی ہے مگر کانگریس کی موقع پرست سیاست نے فرقہ پرست سیاست کو پھلنے پھولنے کے مواقع فراہم کئے

۱۹۱۴ء میں مہاتما گاندھی کو جنوبی افریقا سے بلایا بلکہ لایا گیا تھا جہاں وہ بیس برس سے برطانوی مفادات کیلئے مصروف عمل تھے اور اُن کا Living Legend کا Image بنایا گیا ۔مہاتما گاندھی کی ہندوستان آمد سے نام نہاد آزادی کی تحریک کلیتہً برطانوی حکمت عملی کے تابع ہوگئی اور ماتما گاندھی اُس کے Supreme Leader بن گئے

1930ء کے اوائل میں آزادی کی منزل حاصل ہو جاتی جس پر اشتراکیت اور عوامی انقلاب کی گہری چھاپ ہوتی۔ سو مہاتما گاندھی نے وہی کیا جو برطانوی مفادات کے لئے ضروری تھا۔ مولانا آزاد سبحانی کی رائے میں مسلم لیگ اور کانگریس کے تاریخی کردار اور ان کی قیادت میں کوئی خاص فرق نہیں تھا۔ دونوں ہی جماعتیں برطانوی حکومت کے نمائندوں نے بنائی تھیں اور دونوں جماعتیں وہی فرائض انجام دیتی رہیں جو برطانوی ایوانِ اقتدار کی ترجیحات کے مطابق تھے۔

مولانا آزاد سبحانی کو اس مشن میں کیا کامیابیاں حاصل ہوئیں، وہ تاریخ کا حصہ ہیں۔ ظاہر ہے مسلم آبادی ہمیشہ سے جذباتی نعروں اور سیاست کی حامی رہی ہے، وہ مولانا کے اتنے مآل اندیش مشوروں اور تجاویز کو درخورِ اعتنا کیونکر سمجھتی؟ لہٰذا اُن کی آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی۔ خود ہندوستانی سیاست بھی ترقی اور بائیں بازو کی سیاست ہنوز منزلِ مقصود سے بہت دور ہے۔

مجھے اس بات کا فخر حاصل ہے کہ مجھے مولانا آزاد سبحانی سے کسبِ فیض کرنے کے مواقع میسر آئے اور مجھے ان کے فکر وشعور کی روشنی حاصل کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ پٹنہ میں ان کا قیام وقفے وقفے سے رہا اور قیام کا دورانیہ متعدد دنوں پر محیط تھا۔ مجھے رات گئے تک ان کی صحبت میں بیٹھنے کا شرف حاصل ہوا اور بار بار ہوا۔ مولانا مجھ سے کہا کرتے تھے کہ سوالات کرو۔ ہر چند میں کالج کی زندگی کے ابتدائی دور میں تھا، مگر مجھ میں جستجو اور تاریخی سچائیوں تک رسائی حاصل کرنے کی زبردست طلب تھی۔ وہ دین سے متعلق سوالات کی حوصلہ افزائی نہیں کرتے تھے بلکہ حیات وکائنات کے حوالے سے بنیادی باتوں پر ان کی توجہ مرکوز ہوتی اور وہ انھی دائروں میں اپنی فکر ودانش کے جواہر پاروں سے مجھے بہرہ مند فرماتے۔ خود اپنی زندگی کے مختلف مراحل کا تذکرہ

اور بیان کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ وجود باری تعالیٰ کے حوالے سے انکار و اقرار کے مختلف ادوار سے وہ گزرے ہیں۔ انھوں نے عمر خیام کے وہ کلمات بڑی صراحت کے ساتھ سنائے جو عمر خیام نے اپنی وفات سے کچھ لمحے پہلے لکھے تھے جن کے مطابق فلسفہ تشکیک کا اظہار ہوتا تھا۔ مولانا نے جیسا کہ عرض کیا گیا ہے کہ بڑی فعال زندگی گزاری، دنیا کے بیشتر مسلم ممالک کے دورے کئے اور وہاں کے سماجی اور مذہبی حالات اور تحریکوں سے واقفیت حاصل کی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ ساری مسلم دنیا میں جدید ترکی واحد مسلم ملک ہے جہاں روحِ اسلام کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ بقیہ مسلم ممالک میں اسلام جسدِ بے روح کے عالم میں ہے۔ وہ سیکولر جدید ترکی کے زبردست حامی تھے اور ساری دنیا کو جدید ترکی کی پیروی کرتے دیکھنا چاہتے تھے۔

مولانا آزاد سبحانی، مولانا حسرت موہانی کی طرح اشتراکیت کے حامی تھے۔ ان کے نزدیک اسلام اور اشتراکیت میں کوئی بنیادی تضاد نہیں تھا۔ وہ اسلام کو ایک ارتقاء پذیر فلاحی سماجی دین گردانتے تھے۔ ان کے نزدیک استحصال کی کوئی شکل اسلام سے تعلق نہیں رکھتی تھی۔ وہ اسلام میں مساوات کے تصور اور انسانی اخوت کے نظریے کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ جاگیردارانہ باقیات اور سرمایہ دارانہ نظام کو اسلام سے متصادم گردانتے تھے۔ ان کے مسلک کا سلسلہ حضرت ابوذر غفاری سے ملتا تھا۔

یوں تو مولانا ہمہ وقت ہندوستان کے مختلف شہروں اور قصبوں کے دورے پر رہتے تھے مگر ان کا زیادہ وقت گورکھپور، لکھنؤ اور کانپور میں گزرتا تھا۔ ان کا اصل نام عبدالقادر تھا اور وہ 1882ء میں موضع سکندر پور ضلع بلیا میں پیدا ہوئے تھے اور 1957ء میں گورکھپور میں وفات پائی۔

تحریک خلافت اور ترکِ موالات کے خاتمے کے بعد ہندو فرقہ پرستوں نے آریا سماجی لیڈر سوامی شردھانند کی قیادت میں مسلمانوں کو ترغیب و تحریص اور طاقت کے بل پر ہندو بنانے کے لئے شدھی اور سنگھٹن کی تحریکیں شروع کیں تو ڈاکٹر سیف الدین کچلو، مولانا شبلی اور مولانا آزاد سبحانی نے جوابی تحریکیں چلائیں اور مسلم آبادی کو اس شر اور فتنے سے محفوظ رکھنے میں بڑی کلیدی خدمات انجام دیں جن کی شہرت اور اس کی صدائے بازگشت سارے ہندوستان میں گونجتی تھی۔

مولانا آزاد سبحانی کثیر الجہت شخصیت کے مالک تھے اور ان سے قاموسی اور نابغۂ اعظم کے القابات منسوب کئے جا سکتے ہیں۔ یونانی فلسفے سے لے کر جدید فلسفے کی مختلف جہتوں پر ان کی گہری نگاہ تھی۔ وہ ارسطو اور افلاطون کی بنیادی کتابوں کے مندرجات سے کماحقہٗ آگاہ تھے اور ان پر وہ اپنی ناقدانہ رائے رکھتے تھے۔ مسلم مفکرین میں ابن خلدون، فارابی، ابن رشد، رازی اور البیرونی کے کارناموں اور اظہار پر انہیں دسترس حاصل تھی۔ ہندوستان کے علماء میں مولانا شاہ ولی اللہ دہلوی کے افکار کی معنویت کو قابلِ اعتنا گردانتے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے معترف تھے مگر ان کی سیاست سے شدید اختلاف رکھتے تھے۔ سرسید احمد خاں اور علامہ اقبالؔ کی خدمات کے حوالے سے ان کے کچھ reservations تھے۔ انیسویں صدی میں 1867ء میں قائم ہونے والے دیوبند کے مدرسے کو تاریخ کے تقاضوں سے متصادم گردانتے تھے۔ یہی کچھ رائے وہ لکھنؤ میں قائم ہونے والے مدرسے ندوۃ العلماء اور دوسرے مدارس کے حوالے سے رکھتے تھے۔ انھوں نے خود اپنا ایک مدرسہ کانپور میں قائم کیا تھا جس کا نام مدرسۃ الٰہیات تھا۔ اس مدرسے سے فارغ التحصیل ہو کر نکلنے والے علما اور مبلغوں نے بے شمار ان پڑھ مسلمانوں کو شدھی سے بچا لیا۔ مولانا آزاد سبحانی نے 'روحانیت' کے نام سے ایک ماہنامہ رسالہ بھی گورکھپور سے نکالا تھا جو تحریکِ ربانی کا ترجمان تھا۔ ان کی متعدد تصنیفات مختلف وقتوں میں علمی اور دینی حلقوں میں مرکز توجہ رہیں۔ وہ خود اپنی کتاب الکلیات کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ جناب خلیق ابراہیم خلیقؔ نے اپنی کتاب 'منزلیں گرد کی مانند' میں لکھا ہے:

''مولانا آزاد سبحانی بڑے وسیع القلب اور روشن خیال عالمِ دین تھے۔ انھوں نے مذہبی، سیاسی اور سماجی موضوعات پر کئی کتابیں لکھیں۔ تقسیمِ ہند کے بعد ہندوستان میں مذہبی جنون اور فرقہ وارانہ عصبیتوں کے خاتمے کے لئے جدوجہد کرتے رہے۔ علامہ اقبالؔ، مولانا حسرت موہانی اور مولانا عبیداللہ سندھی کی طرح انھیں مذہب سے بھی بے حد شغف تھا اور اشتراکیت سے بھی متاثر تھے۔ آخر عمر میں سوویت یونین کی سیر بھی کر آئے تھے۔''

میں نے اپنی مختصر خودنوشت 'پاٹلی پترا سے موئن جودڑو تک' میں یہ لکھا ہے کہ مولانا آزاد سبحانی ان چند شخصیات میں سے تھے جن سے میں متاثر بھی ہوا اور وہ میرے شعور و فکر کے ارتقائی سفر میں میرے رہ نما بھی رہے۔ کامریڈ لینن کے لئے ایک فقرہ مجھے یاد ہے کہ وہ سچ کی طرح سادہ تھے۔ یہ فقرہ میں مولانا آزاد سبحانی کے لئے بھی معنویت کا حامل سمجھتا ہوں۔ وہ جب بھی پٹنہ آئے، ریلوے اسٹیشن جو تقریباً دو میل کے فاصلے پر واقع تھا وہاں سے پیدل چل کر آیا کرتے تھے۔ ایک نہایت سادہ لباس میں ملبوس، نہ جبہ و دستار، نہ عالمانہ کروفر، ایک سادہ سی کپڑے کی ٹوپی اور پاؤں میں کالی ربر کی چپل اور کاندھے پر ایک تھیلا جس میں اُن کے کپڑے کا دوسرا جوڑا اور کچھ ضروری اشیاء ہوتی تھیں۔ میں نے دیکھا نہیں ہے مگر سنا ہے اور متعدد کتابوں میں پڑھا بھی ہے کہ مولانا حسرت موہانی بھی اسی حلیے میں پائے جاتے تھے اور ریلوے کے تیسرے درجے میں سفر کرتے تھے۔ مگر اُن کا یہ حلیہ اور عوامی ہیئت مہاتما گاندھی کی طرح نہیں تھی جن کی دکھاوے کی غربت اور مفلوک الحالی کو maintain کرنے کے لئے برلا اور ٹاٹا لاکھوں روپے ماہانہ خرچ کرتے رہے تھے۔ مولانا آزاد سبحانی ایک سچی اور پاکیزہ سیرت کے حامل عظیم انسان تھے اور دکھاوا اور دہری شخصیت کی تہمت اُن پر کبھی نہ لگی۔ ڈاکٹر ادھیکاری کے لفظوں میں وہ ایک سچے اشتراکی اور انقلابی تھے جن پر انھوں نے 'سرخ مولانا' کے نام سے کتاب بھی لکھی جو ایک اہم دستاویز ہے۔

☆☆☆☆☆

مولانا آزاد سبحانی کی رائے میں مسلم لیگ اور کانگریس کے تاریخی کردار اور ان کی قیادت میں کوئی خاص فرق نہیں تھا۔ دونوں ہی جماعتیں برطانوی حکومت کے نمائندوں نے بنائی تھیں اور دونوں جماعتیں وہی فرائض انجام دیتی رہیں جو برطانوی ایوانِ اقتدار کی ترجیحات کے مطابق تھے

قرضوں کا بوجھ اور ہماری سماجی اور اقتصادی ترقی

نعیم شاکر

تیسری دنیا پر قرضوں کا بوجھ ان ممالک کی سماجی اور اقتصادی ترقی کیلئے سدِ راہ ہے۔ان غیر ملکی قرضوں کی وجہ سے ان کی حکومتیں قومی اقتصادی اور سیاسی امور میں شدید دباؤ کا شکار ہے۔طرزِ حکمرانی متاثر ہے اور عوام کی فلاحی منصوبے بھی۔ یہ ممالک برسوں سے ان قرضوں کی ادائیگی کر رہے ہیں۔ مگر اپنی معیشت پر قرضوں کا جواء اتار نہیں سکے۔ بلکہ اس دلدل میں مزید پھنستے جاتے ہیں۔صورت حالات اس سطح پر پہنچ چکی ہے کہ اصل زر پر سود کی اقساط دینے کے لیے رقم میسر نہیں لہذا سود ادا کرنے کے لیے حکمران مزید تگ و دو میں مصروف ہو جاتے ہیں اور نتیجتاً عالمی سطح پر دیوالیہ پن سے بچنے کے لیے عالمی مالیاتی اداروں کی ہر جائز ناجائز شرط ماننے پر تیار ہو جاتے ہیں۔اور یوں رفتہ رفتہ ان اداروں کا اثر ونفوز زندگی کے ہر شعبہ پر پڑنے لگتا ہے اور بالآخر ملک پر حکمرانی کے اصول یہ مالیاتی ادارے وضع کرنے لگتے ہیں۔ان ممالک کی عوام سے متعلق فلاحی منصوبے اور پالیسیاں انہی اداروں کے احکامات پر ترتیب دیئے جاتے ہیں۔حتی کہ شہریوں کی بنیادی سہولتیں جن میں بجلی، گیس اور پانی کے بلوں میں سبسڈی دینے یا نہ دینے کا حکومتی اختیار بھی ان مالیاتی اداروں کی پالیسی کے تابع بنا دیا جاتا ہے۔ بلواسطہ اور بلا واسطہ ٹیکس لگا کر کروڑوں عوام کا جینا مشکل کر دیا جاتا ہے۔تقریباً نصف صدی سے پسماندہ ممالک کے عوام کی زندگیوں پر غیر ملکی قرضوں کے گہرے اور منفی اثرات مرتب ہوئے ہیں۔

2007ء کی ورلڈ بنک ۔گلوبل ڈویلپمنٹ فنانس کی رپورٹ کے مطابق تیسری دنیا کے ممالک پر قرضوں کا بوجھ 2800 ارب ڈالر ہو گیا تھا۔مگر 2010ء کے آخری حصہ میں یہ رقم تقریباً 3000 ارب ڈالر پہنچ چکی ہے۔ان قرضوں کے بوجھ کی بنیادی وجوہات دو ہیں۔ ایک قرضوں کی اقساط کی ادائیگی کے لیے مزید قرضے اور دوسری دفاعی مقاصد ہیں۔مگر قرضوں پر سود کی اقساط کے لیے قرضہ حاصل کرنا ان ممالک کی اقتصادی بدحالی تو ہے ہی مگر ان مالیاتی اداروں کی انسان دشمن پالیسیوں کی بھی غمازی کرتا ہے جن کے شکنجہ میں ان ممالک کو پھنسا کر مجبور کر رکھا ہے کہ وہ قرضوں کے بوجھ تلے رہیں۔ یہ استبدادی گرفت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جا رہی ہے۔دوسری وجہ دفاعی مقاصد کے لیے قرضوں کا حصول ہے۔ یہ ایک گھمبیر مسئلہ ہے ان ممالک کے حکمران دفاعی مقاصد کے حصول کے لیے قرضہ لیتے وقت ان اداروں کے اہلکاروں یا ان اداروں کے سرپرست سامراجی قوتوں سے مشاورت کرتے ہیں یا اپنے ممالک کے عوام اور ان کے نمائندوں سے مشاورت کرتے ہیں۔اس دفاعی مقصد کے زمرے میں فوج میں اضافہ اور ان کی مراعات میں اضافے اور اسلحہ کی ذخیرہ اندوزی شامل ہے۔ بنیادی سوال جس کو آج تمام امن پسند جمہوری اور ترقی پسند قوتیں اُٹھا رہی ہیں وہ یہ کہ ان ممالک کے حکمرانوں کو کیا خطرہ لاحق ہے جس کے لئے یہ فوجیں بڑھا رہے ہیں اور آتشیں اسلحہ ذخیرہ کر رہے ہیں ان کے ڈر خوف میں اضافہ کرنے والی کونسی قوتیں ہیں۔

ان حکمرانوں نے کس پر حملہ کرنا ہے یا کس کے حملے کا دفاع کرنا ہے۔ یہ جنگجو فضا کیوں اور کیسے پیدا ہو رہی ہے۔کونسی قوتیں اس سارے عمل میں کارفرما ہیں۔اس جنگی فضا میں کس کو فائدہ ہو رہا ہے کیا ان ممالک کی عوام جن کے نام پر دفاعی مقاصد کے لیے قرضہ لیا اور دیا جا رہا ہے یا اسلحہ ساز فیکٹریوں کے مالکان اور اسلحہ فروخت کرنے والی کمپنیاں اور پھر ان فیکٹریوں اور کمپنیوں کے میڈل مین اور دوسری طرف ان کے حکمران فوجی قیادت اور وہ فوجی جنرل اور سیاسی حکومتی راہنما جو فیصلہ کرتے ہیں کہ اسلحہ کتنا اور کونسا خریدنا ہے اور کس ریٹ پر خریدنا ہے دراصل یہ ایک پیچیدہ کاروبار ہے جس کے کردار سامراجی ممالک اور ادارے جن میں مالیاتی ادارے اور اسلحہ ساز فیکٹریوں اور کمپنیوں کے مالکان اور مڈل مین اور دوسری طرف ان ممالک کے کرپٹ حکمران اور جرنیل ہیں جو ان ممالک کے عوام پر یہ قرضہ طے در طے لاد رہے ہیں۔

یہ سوالات آج اُٹھائے جا رہے ہیں کہ ری شیڈیولنگ اور ڈیفنس کے کھاتوں میں قرضوں کا حجم اور عوام کے فلاحی منصوبوں پر قرضوں کا حجم کیا ہے۔ اور پھر جو قرضہ فلاحی منصوبوں کے نام پر حاصل کیا گیا اس کے استعمال میں کتنا واقعتاً ان منصوبوں پر صرف ہوا اور کتنا کرپٹ حکمران اور اہلکار ہڑپ کر گئے۔

آیئے ان قرضوں کی روشنی میں اپنے ملک پاکستان کا جائزہ لیتے ہیں۔ اس وقت ہمارے ملک پر ساٹھ ارب ڈالر صرف بیرونی قرضے ہیں جبکہ اندرونی سطح پر قرضوں کا بوجھ ملکی معیشت پر بھی اس کثیر رقم کے قریب ہے ان قرضوں کی رقم یہاں ٹھہر نہیں گئی بلکہ روز بروز بڑھتی چلی جا رہی ہے۔اس کے برعکس ملک کا عام شہری معاشی بدحالی کی وجہ سے زندگی سے بیزار ہے۔تعلیم اور علاج معالجہ تو کیا ننگی بھوک سے تنگ آ کر لوگ اپنے جگر گوشوں کو فروخت کر رہے ہیں یا خودکشیاں کر رہے ہیں۔تعلیم اور علاج معالجہ کی سہولتوں سے محروم ہیں۔

صاف پینے کا پانی جو کہ زندگی کا بنیادی عنصر ہے میسر نہیں۔آلودگی انتہا کو پہنچ رہی ہے جس سے جانور ہلاک ہو رہے ہیں فصلیں تباہ ہو رہی ہیں اور انسان طرح طرح کی بیماریوں کا شکار ہیں ۔غربت ، بیروزگاری، بے کاری، جہالت عام ہے۔انرجی کا بحران ہے جس سے صنعتی یونٹ بند ہو رہے ہیں اور نتیجتاً بیروزگاری اور غربت میں مزید اضافہ ہو رہا ہے۔

انہی قرضوں کی موجودگی میں ہماری حکومت کے فیصلہ کے مطابق علاج معالجہ پر جی ڈی پی کا 0.5 فیصد اور تعلیم پر 1.5 فیصد خرچ ہو رہا ہے جبکہ 90 فیصد دفاع اور ڈیٹ سروس (قرضوں کی ادائیگی) پر صرف ہو رہا ہے۔سرکاری مالی امانت یعنی سبسڈی کے حوالے سے کٹوتی تمام اہم شعبوں میں کر دی گئی ہے۔زراعت کے شعبہ میں 39 فیصد دیہی ترقی 61 فیصد سڑکوں اور پلوں وغیرہ کی فراہمی پر 47 فیصد انسانی بہبود پر 18.5 فیصد پانی کی فراہمی پر 17.35 فیصد خوراک کی مد میں 16 فیصد صحت وعلاج کی مد میں 70 فیصد اور تعلیم کے شعبہ میں 50 فیصد کٹوتی ہمارے رواں سال کے مالیاتی منصوبہ کا حصہ ہیں۔

انہی قرضوں کی موجودگی میں ہماری حکومت کے فیصلہ

کے مطابق علاج معالجہ پر جی ڈی پی کا 0.5 فیصد اور تعلیم پر 1.5 فیصد خرچ ہو رہا ہے جبکہ 90 فیصد دفاع اور ڈیٹ سروس (قرضوں کی ادائیگی) پر صرف ہو رہا ہے۔ سرکاری مالی امانت یعنی سبسڈی کے حوالے سے کٹوتی تمام اہم شعبوں میں کر دی گئی ہے۔ زراعت کے شعبہ میں 39 فیصد دیہی ترقی 61 فیصد سڑکوں اور پلوں وغیرہ کی فراہمی پر 47 فیصد انسانی بہبود پر 18.5 فیصد پانی کی فراہمی پر 17.35 فیصد خوراک کی مد میں 16 فیصد صحت و علاج کی مد میں 70 فیصد اور تعلیم کے شعبہ میں 50 فیصد کٹوتی ہمارے رواں سال کے مالیاتی منصوبہ کا حصہ ہیں۔

Human Development Report 2009 کے مطابق پاکستان عالمی طور پر 101 پوزیشن پر قرار دیا گیا ہے پاکستان پلاننگ کمیشن 2009ء کے مطابق غربت کی لکیر 37.5 فیصد تک پہنچ گئی ہے جبکہ گذشتہ دو سالوں میں یہی لکیر 40 فیصد تک پہنچ گئی ہے۔ جاگیردارانہ اور قبائلی نظام رائج ہے جو صنعتی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے خواتین جو آبادی کا نصف حصہ ہیں ان کو پیداواری عمل سے ملکی قوانین رسم و رواج اور قبائلی، جاگیردارانہ قدروں کی وجہ سے باہر رکھا گیا ہے۔

امر واقعہ یہ ہے کہ ان عالمی مالیاتی اداروں، ملٹی نیشنلز اور قرضہ فراہم کرنے والے ممالک عالمی سرمایہ داری نظام کی آزاد منڈی (فری مارکیٹ اکانوی) کا حصہ ہیں جس نظام کی بنیاد منافع اور صرف منافع ہے۔ اس نظام کے اقتصادی ماہرین کے مطابق منافع کے نظریہ میں اخلاق یا خیر کا کوئی تعلق نہیں۔ ان اداروں اور ان ممالک یعنی سرمایہ کاری جو قرضوں کی صورت بھی ہے کا منافع ملنا چاہیے اگر ورلڈ بنک اور آئی ایم ایف نے قرض دے رکھا ہے اور قرض بلکہ سود کی ادائیگی کے شیڈول میں پس و پیش ہوتی ہو تو وہ آئندہ سود کے لیے کئی پابندیاں عائد کر دیتے ہیں جن میں بجلی، پانی، گیس جیسی سہولتوں میں دی گئی سرکاری مالی امانت کی فوری کمی یا فوری خاتمہ کا مطالبہ ہی نہیں بلکہ حکم جاری کر دیتے ہیں۔ جس کے نتیجہ میں ملک کا محنت کش مزدور طبقہ جس کو موجودہ حکومت کے اعلان کردہ فیصلہ کیے مطابق -/7000 روپے بطور ماہانہ معاوضہ نہیں مل رہا بلکہ اس سے نصف رقم پر وہ اپنی پورے مہینے کی محنت بیچ رہا ہے وہ بجلی، پانی، گیس کے بلوں کی ادائیگی نہیں کر سکتا۔ بچوں کو خوراک، تعلیم اور علاج معالجہ فراہم نہیں کر سکتا۔

مذکورہ اداروں کو غرض نہیں کہ ملک کے کروڑوں عوام جو پہلے ہی زندگی سے بیزار ہیں وہ یہ بوجھ کیسے برداشت کریں گے کیونکہ انہیں اپنے دیئے گئے قرض اور اس پر سود کی ادائیگی چاہیے اور بس۔

اس فری مارکیٹ اکانوی کا سرخیل تو خود امریکہ ہے جس کی اقتصادی اور عسکری طاقت کا تمام عالم میں چرچا ہے اور جس کے سایہ میں یہ مالیاتی ادارے اور ملٹی نیشنلز پنپتے ہیں جس کا عسکری قوت کا عالم یہ ہے کہ امریکہ سے باہر دنیا کے ممالک میں سینکڑوں فوجی اڈے ہیں جن میں کسی کو ملٹری بیس اور کسی کو آرمی انسٹیلیشن قرار دیا جاتا ہے جبکہ امریکی فوجی دیگر درجنوں ممالک میں کئی اور شکلوں میں موجود ہے۔ جہاں کھربوں ڈالر کی لاگت پر ہمہ وقت فوجی دستے تباہ کن اسلحہ سے لیس رہتے ہیں۔ امریکی اقتصادی اور ملٹری طاقت ہی اس کو ایمپائر کا درجہ دیتی ہے۔ عراق اور اب افغانستان بلکہ پاکستان میں بھی جنگی فضا قائم کئے ہوا ہے جس نے مذہب کے نام پر دہشت گردی کی پشت پناہی کی اور ہمارے ہاں معاشرہ ڈرگ اور اسلحہ کلچر کا شکار ہو گیا۔ آج اسی کے پروردہ مذہبی انتہا پسند عناصر ہمارے شہریوں کی سڑکوں گلی کوچوں میں جہاد کے نام پر دہشت گردی اور قتل و غارت میں مصروف ہیں۔ لہذا اس مختصر تحریر میں سردست امریکہ کے دیئے قرضہ اور امداد کا جائزہ لیتے ہیں۔

2002ء سے 2010ء کے عشرہ میں امریکہ نے اٹھارہ بلین ڈالر دفاع اور اقتصادی ترقی کے لیے دیئے۔ فروری 2010ء میں اوباما حکومت نے مزید تین بلین ڈالر کا اضافہ کرتے ہوئے ٹوٹل 20.7 بلین ڈالر دیئے۔ اس رقم کا جائزہ لیتے ہوئے ایک بات ملحوظ رکھنی چاہیے کہ اس رقم کا ضخیم حصہ امریکہ ہی میں رہ جاتا ہے جو اس رقم کو دینے کے لئے ان کے اہلکاروں اور ماہرین (کنسلٹنٹس) کی فیس اور تنخواہوں پر صرف ہو جاتا ہے۔ اس ٹوٹل رقم کے تصرف کا تعین درج ذیل شیڈول واضح ہوگا۔

فوجی اور ترقی کے لئے امداد

سال	ملٹری کیلئے رقم	معاشی ترقی کیلئے رقم
2002ء	1.36	1.233
2003ء	1.500	1.233
2004ء	1.200	1.233
2005ء	1.316	.338
2006ء	1.260	.539
2007ء	1.115	.567
2008ء	1.435	.507
2009ء	1.689	1.366
2010ء	1.233	1.409

امریکی حکومت کے سرکاری نمائندے کے مطابق اس عرصہ میں دفاعی امور پر دی گئی رقم کا 70 فیصد استعمال غلط ہوا۔ اب اس غلط استعمال کا کیا مطلب ہے یہ تو ہمارے حکمران یا فوجی جرنیل ہی بتا سکتے ہیں۔ رہی بات معاشی امداد کی تو وہ امداد کہاں گئی کونسے فلاحی منصوبے پر صرف ہوئی۔ کن کے ہاتھوں صرف ہوئی۔ ملک کے سترہ کروڑ عوام کس سے سوال کریں۔ امریکہ اور یورپی ممالک کے ماہرین تو پہلے ہی ہمارے ملک کی قیادت اور نوکر شاہی (سول و فوجی) کو کرپٹ قرار دیتے ہیں اور ہمارے عوام، میڈیا اور عدلیہ اسی صورتحال کا تذکرہ روز کرتے ہیں۔

لہذا یہ اہم سوال اُٹھانے والے عوام، امن پسند اور ترقی پسند قوتیں حق بجانب ہیں کہ ایسی امداد اور قرضوں کی بھاری قیمت حکمرانوں، نوکر شاہی کو نہیں بلکہ ان کو اُٹھانی پڑتی ہے۔ ایسی امدادی رقوم سے اقتصادی خود انحصاری تو درکنار ہماری قومی خود انحصاری بھی داؤ پر لگ رہی ہے۔ ہمارے پاس بے پناہ انفرادی قوت سے بے انتہا قدرتی وسائل ہیں۔ مگر اس قوت کا منضبط اور ایماندارانہ استعمال پاکستان کے سترہ کروڑ عوام کے نمائندوں کے پاس نہیں ہے کیونکہ اس ملک پر اور اس ملک کے عوام اور قدرتی وسائل پر قبضہ کرپٹ نوکر شاہی اور حکمرانوں کا ہے جو بڑے جاگیرداروں گماشتہ سرمایہ داروں اور مافیہ کا ہے۔ جو دہشت گردوں کی بھی پشت پناہی کرتے ہیں اور مذہبی انتہا پسندی کے خاتمہ کے لیے عملاً کوئی اقدامات نہیں کرتے۔ محض فوجی اپریشن کے ذریعے دہشت گردی نہ مذہبی انتہا پسندی ختم ہوگی۔

اگر ہمارے حکمران نیک نیت ہیں تو ان کو قومی سطح پر

فوری اقدامات کرنا ہونگے۔ تعلیمی نصاب کو سائنس اور جدید ٹیکنالوجی کی روشنی میں ترتیب دینا ہوگا۔ ہم نے اپنی تاریخ کو مذہبی تعصب کی بنیاد پر مسخ کر رکھا ہے اور اسی جذبہ کی بنیاد پر اس دھرتی پر بیرونی حملہ آوروں، ڈاکوؤں اور لٹیروں کو ہیرو بنا رکھا ہے اس کو از سر نو ترتیب دینا ہوگا۔ کاروبار ریاست سے مذہب کا استعمال بند کرنا ہوگا۔ مذہب کے نام پر سیاست کرنے والی جماعتوں پر پابندی عائد کرنا ہوگی۔ ریاست کو کثیر القومی اور کثیر المذاہب قرار دینا ہوگا اور قرارداد پاکستان اور قائداعظم کی 11 اگست 1947ء کے خطاب میں بتائے گئے زریں اصولوں پر عملدرآمد کرنا ہوگا۔ اور اس مقصد کے لیے قومی سطح پر میڈیا کو استعمال کرنا ہوگا۔ آئین 1973ء کو مذکورہ اصولوں کی روشنی میں از سر نو ترتیب دینا ہوگا اس کے علاوہ اس پالیسی بلکہ انداز فکر کو ترک کرنا ہوگا جس کی بنیاد پر ہم نے Security Paradigm ترتیب دی اور ملک کو سکیورٹی سٹیٹ بنا کر تمام معاشرہ کو عسکریت پسندی کر طرف دھکیلا اس پالیسی کے پیش نظر جہاد اور مذہبی انتہا پسندی کے جذبے پروان چڑھے۔ جن انتہا پسند عناصر نے آج سماج کو ادھیڑ کر رکھ دیا ہے اور یرغمال بنا رکھا ہے۔

ہمارے کئی دوست پیرس ڈیکلریشن جس کے ذریعے سرد جنگ کے خاتمہ کا اعلان کیا گیا کو بڑی سادگی سے جنگوں کا خاتمہ تصور کرتے ہیں جبکہ یہ ڈیکلریشن دو عالمی متحارب گروپوں کے مابین طے پایا تھا جو سوشلسٹ بلاک اور وہ بلاک جو عالمی سرمایہ دارانہ نظام کا داعی ہے۔ سرد جنگ کے خاتمہ کے بعد یک قطبی طاقت امریکن ایمپائر کی صورت میں سامنے آئی اس اعلان سے بنیادی تضادات تحلیل نہیں ہوئے۔ گلوبل فنانس کارپوریٹ کے پھیلاؤ کے ساتھ اس اقتصادی نظام اور اس کے قائدین کے جدید نو آبادیاتی کردار سے بنیادی تضادات پہلے سے زیادہ ابھر کے سامنے آئے ہیں۔ امریکہ اس نظام کا لیڈر ہے اور اس کا کردار اور پالیسیاں اسی نظام سے نہ صرف جڑی ہوئی ہیں بلکہ وہ اب واحد عالمی طاقت کی صورت میں اور زیادہ مضبوط اور توسیع پسندی اور جارحیت میں اور زیادہ پیش پیش ہے جبکہ کمزور اور پسماندہ ممالک اسکے اس کردار کا اور زیادہ شکار ہیں۔ پاکستان اور تیسری دنیا کے دیگر ممالک میں امریکی امداد مذکورہ کردار ہی سے وابستہ ہے۔ لہذا اگرچہ بشمول پاکستان ان ممالک کو سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں امداد کی اشد ضرورت ہے مگر کسی امداد کے اعلان پر زیادہ خوش فہمی کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمارے ارباب بست و کشاد کو امداد وصول کرنے سے قبل امداد حاصل کرنے کے لئے قومی اور عوامی مقاصد کا تعین کریں۔ ترقی کی منازل پر گامزن ہونے کے لیے قومی ترجیحات کے ملحوظ رکھتے ہوئے اس شعبہ کا تعین کریں جس پر امداد کی ضرورت ہو اور اس مقصد کے لئے عوامی نمائندوں اور متعلقہ ماہرین سے مشاورت کے بعد فیصلہ کریں اور میڈیا کے ذریعے اس امداد کے مقاصد اور استعمال سے عوام کو باخبر رکھیں اگر کسی امداد نے محض حکمرانوں کی تجوریوں کو مزید بھرنا ہے تو ایسی امداد عوامی مفادات کے منافی ہے۔ امریکہ نے دنیا کے کئی خطوں میں براہ راست اور بلواسطہ طور پر جنگ جاری کر رکھی ہے۔ ہر خطہ میں اس کے اعلان کردہ مقاصد فرق فرق ہیں۔ ان مقاصد کا تجزیہ کسی اور تحریر کے لئے چھوڑتے ہیں۔ بہرحال اعلان کردہ امداد کا مقصد جنگ زدہ علاقوں کے لوگوں کو سماجی اور معاشی طور پر بحال کرنا ہے جو ان جنگوں کی وجہ سے تباہ برباد ہوئے ہیں۔ واشنگٹن نے وسط ایشیا میں یونان، مصر، لبنان اور اسرائیل کے لیے ایسے علاقوں کے لوگوں کو صنعتی مرعات فراہم کرنے کا اعلان کیا ہے۔ اور ایسے ہی علاقے افغانستان اور پاکستان کے شمال مغرب میں ہیں۔ اس امدادی پالیسی کے مطابق ان علاقوں کو Reconstruction Opportunity Zones قرار دیا گیا ہے۔ ہمارے ملک کے حوالے سے یہ علاقہ پاکستان اور افغانستان کے بارڈر کا حصہ ہے وسط ایشیا میں ان علاقوں کا نام Qualifying Industrial Zones رکھا گیا ہے۔ امدادی پالیسی کے مطابق ہمارے شمال مغربی علاقہ میں صنعتی اور تجارتی ترقی کو فروغ دیا جائے گا جس سے ان علاقہ کے لوگوں کو روزگار فراہم ہوگا۔ ان علاقوں کی صنعتی پیداوار کو امریکی منڈی میں ڈیوٹی کے بغیر پندرہ سال تک یعنی 2023 تک یہ سہولت حاصل ہوگی۔ صنعتی پیداوار میں جن اشیاء کا تعین کیا گیا ہے ان میں ٹیکسٹائل کی مصنوعات جن میں کپڑے اور گھروں میں استعمال ہونے والی اشیاء، چمڑے کی مصنوعات جن میں جوتے، دستانے اور ہینڈ بیگ ہیں۔ ماربل، لکڑی کا فرنیچر، سرامک ٹائیلز، کارپٹ، جیم اور جیولری اور زرعی پیداوار جوان علاقوں سے متعلق ہوں۔

امریکی منڈی کے لئے 15 سال کی ڈیوٹی فری سہولت یقیناً صنعتی اور تجارتی حلقوں کے لئے خوش آئینہ ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا ان علاقوں میں مذکورہ صنعتیں موجود ہیں۔ اگر ایسی صنعتیں ان علاقوں میں موجود نہیں تو کیا پاکستان کی معیشت اس وقت مفلوک الحال کا شکار سے اور پے در پے قرضوں کے انحصار پر قومی بجٹ کو چلانے کی کوشش کر رہی ہے اس قابل ہوگی کہ وہ اس سہولت سے فوری استفادہ کر سکے۔ کیا ان نئی صنعتوں کو لگانے کے لئے پاکستان مزید قرضے لے گا۔ کن سے اور کن شرائط پر۔ یہ ڈیوٹی کی سہولت ایسے علاقوں کے لئے نہیں جہاں صنعتیں موجود ہیں۔ جن کے مالک اور تاجر ہمہ وقت اسی جدو جہد میں مصروف رہتے ہیں کہ امریکی منڈی تک ان کی رسائی ہو جس کے لئے وہ ڈیوٹی فری کی سہولت بھی نہیں مانگتے بلکہ عالمی منڈی میں وہ دیگر ممالک کے مقابلے میں کوٹہ مانگتے ہیں۔ لہذا اگر حکومت پاکستان نے فیصلہ ہی کر لیا ہے کہ اس نے علاقوں کے لئے امریکی امداد وصول کرنا ہے تو حکومت کو چاہیے کہ متعلقہ شعبوں کے متعلق ماہرین پر مشتمل کمیشن مقرر کرے جو اس امداد کا عوامی اور قومی بنیادوں پر جائزہ لیں تا کہ اس قسم کی امداد کو محض علاقہ میں امریکی اثر و نفوذ بڑھانے کے لیے استعمال نہ کیا جائے بلکہ اس علاقہ کے مصیبت زدہ لوگ دوبارہ کاروبار زندگی میں مصروف ہو سکیں۔

ہمارے ملک کا پانچواں حصہ حالیہ سیلاب سے تباہ و برباد ہوا۔ انسانی جانوں کے علاوہ مویشی، فصلیں اور کھربوں کی املاک تباہ ہوئیں۔ عالمی امداد کے باوجود ہماری حکومت ابھی تک سیلاب زدہ علاقوں کے لوگوں کو بحال نہیں کر سکی۔ عالمی طور پر اس سیلاب کو تاریخ کا تباہ کن سیلاب کہا گیا۔ جس نے ہماری ملکی معیشت پر گہرے اثرات چھوڑے ہیں۔ چند برس قبل زلزلہ کی صورت ایسی ہی ایک اور قدرتی آفت نے ہمارے بیشتر علاقوں میں مصیبت ڈھائی تھی۔ سینکڑوں جانیں تلف اور املاک برباد ہوئی تھیں۔ اس تباہی کے اثرات آج بھی موجود ہیں جبکہ 11 ستمبر 2001ء سے ہمارا ملک وار آن ٹیرر میں امریکہ کا فرنٹ لائن کا اتحادی ہے دہشت گردی

باقی صفحہ نمبر 12 پر

پاکستان۔امریکہ اور ترقی کے امکانات

روشن لعل

قیام کے بعد سے پاکستان کو امریکی امداد پر منحصر ملک بنا دیا گیا تھا۔ تاریخ شاہد ہے کہ قیام پاکستان کے بعد سے 9/11 کا واقعہ رونما ہونے تک پاکستان کے حکمرانوں، سول و ملٹری بیوروکریسی اور دائیں بازو کے غیر حکومتی عناصر نے کبھی بھی نہ تو امریکی امداد، نہ اس امداد کے لئے عائد کی گئی شرائط اور نہ ہی اس امداد کی آڑ میں پاکستان کے داخلی معاملات میں امریکی کردار کی مخالفت کی۔ یہ تبدیلی 9/11 کے بعد واقع ہوئی جب پاکستان کا دایاں بازو جو اس سے پہلے یہاں امریکی امداد اور کردار کے حوالے سے ہمیشہ خاموش رہا نے اپنے معمول کے رویے کے برعکس امریکی امداد اور کردار پر ناگواری کا اظہار کرنا شروع کر دیا۔ یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ قیام پاکستان یا بیسویں صدی کے وسط سے اس کے اختتام تک امریکہ کے حواری رہنے والے دائیں بازو کے رویوں میں امریکہ کے لئے تبدیلی کیوں رونما ہوئی؟

قیام پاکستان، دوسری جنگ عظیم کے اختتام اور سرد جنگ کے آغاز کا زمانہ تھا۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان کے حکمرانوں نے سرد جنگ کے حریفوں میں سے امریکہ کا حلیف بننے کو ترجیح دی۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران متحارب ملکوں میں ہونیوالی ہولناک تباہیوں نے ان ملکوں کو مزید روائتی جنگوں سے گریز پر مجبور کیا۔ ایسا کرنے سے امریکہ اور مغربی ملکوں کے وہ معاشی یا سامراجی مفادات ختم نہ ہو سکے تھے جو دوسری جنگ عظیم کا محرک تھے اور جن کے حصول کے لئے ان کا کمزور قوموں کے وسائل کو اپنے زیر تسلط رکھنا ضروری تھا۔ جنگ عظیم دوم کے بعد سوویت یونین کے ہاتھوں ہٹلر کی فوجوں سے واگزار کرائے گئے ملک سوشلسٹ بلاک کا حصہ بن گئے تھے۔ مغربی ملکوں نے سوشلسٹ بلاک کی وسعت کو پوری دنیا میں پھیلے ہوئے اپنے معاشی مفادات کے برعکس خیال کرتے ہوئے ان مفادات کے تحفظ کے لیے امریکہ کی سرکردگی میں 1949ء میں فوجی اتحاد ناٹو کی بنیاد رکھی۔ ناٹو کے قیام کا بنیادی محرک سوشلسٹ بلاک کے مزید پھیلاؤ کا خوف تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ امریکہ کی سرکردگی میں بننے والا فوجی اتحاد ناٹو سوشلسٹ بلاک کے خلاف تھا۔ قیام کے فوراً بعد اگر پاکستان کے حکمرانوں نے اپنے ملک کو سیٹو اور سینٹو میں شامل کر کے امریکہ کا حلیف بنایا تھا تو اس کا مطلب ہے کہ انہوں نے اپنے ملک کو سوشلسٹ بلاک کے خلاف استعمال ہونے کے لیے پیش کیا تھا۔ اپنا حلیف بنانے کے بعد امریکہ نے پاکستان کو فوجی امداد دینے کا سلسلہ شروع کیا۔ پاکستان کے حکمرانوں نے اپنے عوام کو یہ باور کرایا کہ امریکہ سے ملنے والی امداد اس کی عسکری طاقت کے لیے ہے جسے وہ انڈیا کے خلاف استعمال کر سکتا ہے جبکہ امریکہ بین الاقوامی طور پر یہ تاثر دیتا رہا کہ پاکستان کو دی گئی فوجی امداد اس کا وہ ہتھیار ہے جسے ضرورت پڑنے پر وہ سوویت یونین کے خلاف اور سوشلسٹ بلاک کی وسعت کو روکنے کے لیے استعمال کر سکتا ہے۔

پاکستان کو دی گئی امریکی فوجی امداد کے حوالے سے بنیادی سچائی یہی ہے کہ یہ امداد پاکستان کے دفاع کے لیے نہیں بلکہ امریکی مفادات کے تحفظ کے لیے تھی۔ اس کی سب سے بڑی مثال یہ ہے کہ 1965ء کی جنگ میں جب پاکستان نے امریکہ سے ملنے والا اسلحہ انڈیا کے خلاف استعمال کیا تو امریکہ نے پاکستان کو دی جانے والی فوجی امداد پر پابندیاں عائد کر دیں۔ اس طرح 1971ء کی جنگ میں پاکستانی عوام ساتویں امریکی بحری بیڑے کا انتظار کرتے رہے لیکن وہ تمام تر خوش فہمیوں کے باوجود نہ آ سکا۔ اس طرح کے امریکی رویہ کی حقیقی وجہ یہی تھی کہ نہ تو 1965ء کی جنگ امریکی مفادات کے لیے لڑی گئی تھی اور نہ ہی 1971ء کی جنگ اس سوشلسٹ بلاک کے خلاف تھی جس کے خاتمہ کے لیے ناٹو کا فوجی اتحاد بنایا گیا تھا۔

دسمبر 1971ء کی جنگ کے دوران پاکستان کے دولخت ہونے میں امریکہ کی جانب سے دکھائی جانے والی سرد مہری کا بھی ہاتھ تھا اس کے باوجود اس ملک کی اشرافیہ نے امریکی بلاک کا حصہ بنے رہنے کو ترجیح دی۔ اس عمل کے زیر اثر ہی 70 کی دہائی کے آخر میں یہاں موجود فوجی حکومت اور اس کے خیر خواہ دائیں بازو نے جہاد کے نام پر امریکی مفادات کے لیے افغانستان میں موجود سوویت فوجوں کے خلاف پاکستان کو براہ راست لا کھڑا کیا۔ پاکستان اور یہاں موجود عسکریت پسند غیر ریاستی عناصر کے امریکی حمایت سے ادا کیے گئے کردار کی وجہ سے ہی امریکہ نے سوویت یونین کو افغانستان سے اس کی فوجوں کے انخلاء پر رضا مند کیا۔ ایسا ہونا اصل میں امریکی مفادات کی تکمیل تھا لیکن پاکستان کے ریاستی، غیر ریاستی اور مخصوص مذہبی عناصر نے نہ صرف اسے اپنی فتح قرار دیا بلکہ یہاں ایک حاضر سروس فوجی جرنیل کو فاتح جہاد افغانستان کا خطاب بھی دیا گیا۔

سرد جنگ کے دوران جب پاکستان کو امریکی مفادات کے لیے استعمال کیا گیا تو اس دوران میں بھارت سوویت یونین کے زیادہ قریب رہا، آج اگر انڈیا کو اسکی فولاد کی پیداوار، آئل ریفائنریوں، بھاری صنعتوں، معیاری پرزہ جات، آلات اور اوزاروں کی تیاری، توانائی کی پیداوار، فارماسیوٹیکل اور دوسری کیمیائی صنعتی پیداوار کی وجہ سے دنیا کی ابھرتی ہوئی معاشی طاقتوں میں شمار کیا جا رہا ہے تو اس کی بنیادی وجہ سرد جنگ کے زمانے میں اس کی موجودہ صنعتوں کے لیے سوویت یونین کی فراہم کردہ ٹیکنالوجی اور ضروری امداد ہے۔

سرد جنگ کے زمانے میں جب پاکستان جیسے ملکوں کے حکمران محض اپنے اقتدار کے تحفظ کے لیے امریکہ کے ساتھ جڑے ہوئے تھے اس وقت بھارت اپنے بہتر معاشی مستقبل کے لیے سوویت یونین کے تعاون سے صنعتی ترقی کی راہیں استوار کر رہا تھا۔ سوویت یونین کے ساتھ مثالی دوستی رکھے ہوئے تھی بھارت کی حیثیت وارسا پیکٹ میں شامل سوشلسٹ بلاک کے کسی ملک جیسی نہیں تھی۔ روس سے بے مثال دوستی کے باوجود اس وقت بھی اس نے چین کے ساتھ اپنے تعلقات کو غیر متنازعہ رکھنے اور مغربی یورپ و امریکہ کے ساتھ بہتر بنانے کی کوششیں جاری رکھیں۔ سرد جنگ کے دوران بار ہا ایسا ہوا کہ سوویت یونین نے پاکستان کو بھی اقتصادی اور صنعتی تعاون کی پیشکش کی جسے پاکستان کے حکمران اپنے مخصوص مفادات کی وجہ سے ٹھکراتے رہے۔

1991 میں سوویت یونین کے خاتمہ کے بعد دنیا میں کوئی ایسا ملک باقی نہ رہا جو پاکستان جیسے ملکوں کو ٹیکنالوجی سمیت صنعتی تعاون کی پیشکش کرتا۔ سوویت یونین کے خاتمہ

کے بعد جب پاک افغان خطے میں امریکی مفادات کی اہمیت 1980ء کی دہائی جیسی نہ رہی تو امریکہ یہاں موجود جنگجوؤں کو ان کے حال پر چھوڑ کر اپنی امداد سمیت رخصت ہوگیا۔اگر 11/9 کا واقعہ پیش نہ آتا تو اس خطے کے ساتھ امریکی بے اعتنائی شاید اس طرح برقرار رہتی۔11/9 کے واقعہ نے امریکہ کو یہ احساس دلایا کہ افغان جہاد کے نام پر اس نے جو مجاہد تیار کیے تھے وہ اصل دنیا کی تہذیب اور امن تباہ کرنے کے عزائم رکھنے والے دہشت گرد ہیں۔ان دہشت گردوں کے خلاف نہ صرف امریکہ نے کھلی جنگ کا علان کیا بلکہ پاکستان کے حکمرانوں کو بھی اپنا فرنٹ لائن اتحادی بننے پر مجبور کیا۔

اس طویل جنگ کے دوران دواہم تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ایک طرف تو دہشت گردوں کی کاروائیوں کے بعد پاکستان کے عوام پر ان کی سفاکی، جہالت اور قدامت پرستی آشکار ہوئی اور انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ جب دہشت گرد پاکستان کے عام آدمی کی جان و مال کو نقصان پہنچا رہے ہیں تو ان کے خلاف لڑی جانے والی جنگ کسی اور کی نہیں بلکہ ان کی اپنی جنگ ہے،دوسری طرف امریکہ کو یہ احساس ہوا کہ جب تک پاکستان کا سماجی ڈھانچہ تبدیل نہیں ہوگا اور یہاں اقتصادی حالات بہتر نہیں ہوں گے اس وقت تک یہاں موجود دہشت گردوں کی نرسیاں ختم نہیں ہوسکیں گی۔اپنے اس احساس کی وجہ سے ہی امریکہ پاکستان کی اقتصادی اور صنعتی ترقی کے لیے تقریباً اسی طرح کا کردار ادا کرنے پر آمادہ ہوا جو کبھی سوویت یونین نے بھارت کے لیے ادا کیا تھا۔جس طرح امریکہ نے پاکستان کو ریجنل اپر چونٹی زونز میں صنعتوں کے قیام کے ساتھ ہی ان صنعتوں میں تیار شدہ مال کی امریکی منڈیوں میں فروخت کی پیشکش کی ہے۔کبھی اسی طرح سویت یونین بھی اپنے تعاون سے بھارت میں قائم کی گئی صنعتوں کو خام مال کی فراہمی کے بعد ان صنعتوں کے نیم تیار اور مکمل تیار مال کا خریدار ہوا کرتا تھا۔

سوویت یونین نے جس پالیسی کے تحت بھارت سے تعاون کیا تھا اس کے مطابق وہ تیسری دنیا کے ہر ملک کے ساتھ تعلقات قائم کرنے کیلئے تیار تھا جبکہ اس وقت کے امریکہ کے لیے ایسا نہیں کہا جاسکتا تھا۔امریکہ نے پاکستان کو جس تعاون کی پیشکش کی ہے وہ پاکستان جیسی معیشت کے حامل دنیا کے ہر ملک کیلئے ہے۔پاکستان کے ساتھ امریکہ کے اس خصوصی رویے کی وجہ یہ ہے کہ عالمی سرمایہ دارانہ نظام کا رہبر ملک ہونے کے ناطے اس کے سرمایہ دارانہ مفادات جس طرح اس وقت پاکستان کے ساتھ وابستہ ہیں وہ کسی اور ملک کے ساتھ نہیں ہیں۔پاکستان میں اس وقت ایسے لوگ موجود ہیں جو ماضی میں امریکہ کے سرمایہ دارانہ مفادات کی وجہ سے اس کی کسی بھی قسم کے امداد کے مخالف ہیں۔سرد جنگ کے زمانے میں ان کے امریکہ مخالف رویے کو اس لیے جائز قرار دیا جاسکتا ہے کیونکہ اس وقت امریکہ کی امداد کو ٹھکرا کر سوویت یونین سے زیادہ بہتر اور آسان شرائط پر امداد حاصل کرنے کا آپشن موجود تھا لیکن اس وقت جب سوویت یونین جیسا کوئی متبادل نہیں ہے اور اس امداد کی ضرورت بھی ہے جو امریکہ ہمیں دینے کی پیشکش کر رہا ہے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیونکر اس کی امداد ٹھکرا کر گو امریکہ گو کا نعرہ لگانا چاہیے؟

امریکہ نے سرد جنگ کے زمانے میں خود عامل بن کر پاکستان کو معمول کی طرح سوویت یونین اور سوشلسٹ بلاک کے خلاف استعمال کیا تھا۔اب اگر امریکہ پاکستان کو امداد دینے کی بات کر رہا ہے تو یہاں ایسا کوئی سوویت یونین نہیں ہے جسے گرانے کے لیے وہ اپنی امداد کے بدلے پاکستان کو استعمال کرسکتا ہے۔اس وقت بین الاقوامی صورتحال یہ ہے کہ کہ سرمایہ دارانہ معیشت کے حامل ملک اپنے منافع کے تحفظ کے لیے سرمایہ صنعت اور ٹیکنالوجی ان ملکوں تک لے جا رہے ہیں جہاں انہیں اپنا مال تیار کرنے کے لیے سستی محنت اور خام مال دستیاب ہوسکتا ہے اور اس کے بعد اس خطے میں تیار مال فروخت ہونے کے لیے منڈی بھی موجود ہو۔ایک طرف تو پاکستان میں اگر دہشت گردی نہ ہو تو اس وقت وہ تمام لوازمات موجود ہیں جو بیرونی سرمایہ کاری کے لیے ضروری تصور کیے جاتے ہیں اور دوسری طرف پاکستان کی جغرافیائی حیثیت ان تمام ملکوں کے لیے داخلی دروازے یا اس رہگذر کی سی ہے جہاں سے گزر کر ہی بیرونی سرمایہ کاری کو ان ممالک تک لے جایا جاسکتا ہے جہاں خام مال،معدنیات اور قدرتی ذخائر بہتاب میں موجود ہیں۔پاکستان میں اب تک جسقدر بھی ترقی ہوئی ہے اس کا وقوع پذیر ہونا کسی بیرونی عامل کی امداد کے بغیر ممکن نہیں تھا۔جب پاکستان میں بیرونی امداد کے بغیر ترقی ناممکن ہے تو کیا وجہ ہے کہ امریکی امداد کو اس وقت دھتکارا جائے جب وہ ماضی کے برعکس حالات میں تبدیل شدہ شرائط اور رویوں کے ساتھ ہمیں امداد کی پیشکش کر رہا ہے۔

بلاشبہ امریکہ اس وقت بھی دنیا کی بڑی صنعتی،اقتصادی اور عسکری طاقت ہے۔اس کے باوجود اس کا عروج نصف النہار پر نہیں ہے۔امریکہ کے ماضی کے برعکس اس وقت یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ وہ اپنے سمیت پوری دنیا میں ہونے والی مادی ترقی کو محفوظ دیکھنا چاہتا ہے۔امریکہ اس وقت بھی ماضی کی طرح اپنی سرحدوں سے دور جنگ میں مصروف ہے لیکن ماضی کے برعکس شاید پہلی مرتبہ اسکی منصوبہ بندی میں جنگ کے بعد کی جانے والی تعمیر کا احاطہ بھی کیا گیا ہے۔بعض لوگوں کا خیال ہے کہ امریکہ کی تبدیل شدہ سوچ اور رویہ صرف ہمارے خطے کے لیے ہے۔مختلف ملکوں،علاقوں اور خطوں کے لیے امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی پالیسیاں اور منصوبہ بندی مختلف ہے۔امریکہ کے متعلق یہ خیال شاید درست ثابت ہوسکتا ہے اس کے باوجود ہمارے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ ہم پاک امریکہ تعلقات کو اس عینک سے دیکھیں کہ لاطینی امریکہ کے ممالک کے لیے اس کی کیا پالیسیاں ہیں یا کسی دوسرے ملک کے لیے اس کا کیا رویہ ہے۔

اگر دنیا میں کہیں کچھ غلط ہو رہا ہے تو اقوام عالم کا رکن ہونے کے ناطے اس کی مذمت کرنا یا اس کے خلاف ردعمل کا اظہار کرنا ہم پر لازم ہے۔ایسا کرتے ہوئے ہمیں یہ بات مدنظر رکھنا ہوگی کہ اس سے آگے جانا ہماری بساط اور ہر حد سے باہر ہے۔اس وقت ہماری پہلی ترجیح یہ ہونی چاہیے کہ ہمارے ملک میں جاری معاشی بحران کا جلد از جلد خاتمہ ہو۔اس ترجیح کو مدنظر رکھنا ہوگی کہ اس سے آگے جانا ہماری بساط اور ہر حد سے باہر ہے۔اس وقت ہماری پہلی ترجیح یہ ہونی چاہیے کہ ہمارے ملک میں جاری معاشی بحران کا جلد از جلد خاتمہ ہو۔اس ترجیح کو مدنظر رکھتے ہوئے پوری قوم کو جذباتی دائروں سے باہر نکل کر امریکی امداد کے لیے سنجیدگی کا اظہار کرنا ہوگا۔پاکستان کی تاریخ میں شاید پہلی مرتبہ امریکہ نے نہ صرف امداد کے لیے فوج کی بجائے سول حکومت کو ترجیح دی ہے بلکہ اپنے سابقہ تجربات کے پیش نظر امداد کے تصرف کو امریکی آڈیٹروں کے شفاف آڈٹ سے مشروط کردیا ہے۔

اس باب سے یہ نتیجہ اخذ کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے کہ امریکہ نے پاکستان کو توانائی کے بحران کے خاتمے ،اقتصادی ڈھانچے کی مضبوطی اور صنعتوں کے قیام کے لیے دی جانے والی امداد کو شفاف آڈٹ سے مشروط کر دیا ہے تو اس سے اسکی یہی مراد ہے کہ اس کی دی گئی امداد حسب سابق کرپشن کی نظر یہ نہ ہو بلکہ عوام کا معیار زندگی بہتر بنانے میں صرف ہو۔امریکہ کے اس طرح کے رویے کی موجودگی بیرونی امداد پر انحصار کرنے والے ملک پاکستان کے عوام کے لیے گو امریکہ گو نعرہ لگانے کا کی جواز باقی رہتا ہے؟

نوٹ:

روشن لعل کا یہ مضمون ہم دو وجوہات کے پیش نظر شائع کر رہے ہیں اول یہ کہ اپنے نقطۂ نظر کا اظہار انکا جمہوری حق ہے، وہ ہمارے پرانے ساتھی ہیں اور عوامی جمہوریت ،اپنے صفحات جمہوری اظہار خیال کیلئے کھلے رکھتا ہے۔دوسری متنازعہ معاملات پر کھلی بحث ترقی پسند نظریات کو نئے حالات اور عالمی تناظر میں پرکھنے اور اپنے سیاسی عمل کے راستے متعین کرنے میں مدد ملتی ہے ۔جہاں تک اس مضمون کا تعلق ہے،عوامی جمہوریت ،یہ واضح کر دینا چاہتا ہے کہ ورکرز پارٹی پاکستان کا یہ واضح موقف ہے کہ سویت یونین کے ٹوٹنے ،سرد جنگ کے خاتمے اور ایک متبادل سوشلسٹ بلاک کی غیر موجودگی کے باوجود سرمایہ دارانہ نظام کے بنیادی تضادات اور گلوبل کارپوریٹ اور فنانس معیشت کے پھیلاؤ کے ساتھ اسکا جدید نوآبادیاتی کردار پہلے سے زیادہ ابھر کے سامنے آئے ہیں ۔امریکہ کی عالمی اقتصادی پالیسیاں اس کردار سے الگ نہیں ہیں ۔البتہ یہ درست ہے کہ جدید ٹیکنالوجی اور ترقی یافتہ صنعت میں پیش رفت کیلئے انحصار بھی زیادہ تر انہی ترقی یافتہ سرمایہ دار ممالک پر کرنا پڑتا ہے ۔یہ بات بھی درست نہیں ہے کہ دنیا میں کم ترقی یافتہ اور نیم ترقی یافتہ ممالک میں جاری اپنی معاشی اور سیاسی آزادی کی جدوجہد کی تحریکوں کو نظر انداز کر کے عالمی سطح پر معاشی اور سیاسی بالادستی اور استحصال کے نظام کو بدلا جا سکتا ہے۔ہم اسی پرچے میں 'امداد' قرضوں کے ضمن میں کچھ معلومات پیش کر رہے جو اس گمان کی تردید کرتے ہیں کہ امریکہ ہماری ترقی میں دیانتدارانہ دلچسپی رکھتا ہے۔)

ادارہ

بقیہ: نعیم شاکر

کے خلاف جنگ نے اس دھائی میں پورے ملک کو اپنے لپیٹ میں لے رکھا ہے یہ جنگ جو افغان پاکستان بارڈر پر لڑی جا رہی ہے اس نے جنگ کا دائرہ ملک کے اندر بڑھا دیا ہے۔اِس جنگ میں ہزاروں لوگ ہلاک اور املاک تباہ ہو چکے ہیں۔ملکی معیشت بیرون ملک گئے شہریوں کی بھیجی ہوئی رقوم پر انحصار کرتی ہے جو زرمبادلہ میں اضافہ کا سبب ہے۔مگر ملک کے اندر عسکری فضا موجود ہے امن عامہ کا مستقل مسئلہ ہے۔کراچی جیسا بڑا صنعتی شہر ایک عرصہ سے مافیہ کی دہشت گردی کا شکار ہے۔جس سے صنعت کو شدید نقصان ہوا ہے۔زراعت کا شعبہ جو کہ معیشت کے لئے ریڑھ کی ہڈی تصور کیا جاتا ہے۔اس قابل نہیں رہا کہ اناج میں خود کفیل ہو سکے ۔اس صورت حالات میں ہماری معیشت لرزاں ہے۔اور اس قابل نہیں رہی کہ بیرونی قرضے ادا کر سکے ۔جن رقوم کی زیادہ تعداد فوجی آمروں نے دفاعی مقاصد کے لیے حاصل کی ،حکومت پاکستان نے فوجی قرضے ملک کے عوام کے نام پر لئے جبکہ ان قرضوں کا استعمال عوامی مقاصد کے لیے نہیں ہوا۔لہذا پاکستان کا مقدمہ قانونی اور اخلاقی اعتبار سے ٹھیک ہے کہ اس پر بیرونی قرضے ختم کر دیئے جائیں۔اس مقدمہ کے لئے دلائل مضبوط ہیں مگر یہ مقدمہ بحرحال ہمارے موجودہ حکمرانوں کو عالمی سطح پر دائر کرنا ہے۔

ملک کے اندر جمہوری اور ترقی پسند سیاسی قوتوں کی تحریک کمزور سہی مگر موجود ہے جو بیرونی قرضوں کے لئے مطالبہ کر رہی ہے۔جبکہ عالمی سطح پر بھی عوامی ادارے اس تحریک کو آگے بڑھانے کیلئے برملا اظہار کر چکے ہیں۔عالمی سطح پر ایسی نظیریں موجود ہیں جن میں متاثرہ ممالک نے انہی دلائل کی بنیاد پر قرضوں کے خاتمہ کے لئے تحریک چلائی اور کئی کامیاب بھی ہوئے ہماری حکومت کو بھی چاہیئے کہ اس مقدمہ کو دائر کرنے کیلئے فیصلہ کریں اور عالمی برادری سے اپیل کریں کہ اس مشکل وقت میں وہ پاکستان کا ساتھ دیں۔

آؤ کہ آج غور کریں

آؤ کہ آج غور کریں اس سوال پر
دیکھے تھے ہم نے جو وہ حسین خواب کیا ہوئے
دولت بڑھی تو ملک میں افلاس کیوں بڑھا
خوشحالئ عوام کے اسباب کیا ہوئے
جو اپنے ساتھ ساتھ چلے کوئے دار تک
وہ دوست، وہ رفیق، وہ احباب کیا ہوئے
کیا مُول لگ رہا ہے شہیدوں کے خون کا
مرتے تھے جن پہ ہم وہ سزا یاب کیا ہوئے
بے کس برہنگی کو کفن تک نہیں نصیب
وہ وعدہ ہائے اطلس و کمخواب کیا ہوئے
جمہوریت نواز، بشر دوست، امن خواہ
خود کو جو خود دیئے تھے وہ القاب کیا ہوئے
مذہب کا روگ آج بھی کیوں لا علاج ہے
وہ نسخہ ہائے نادر و نایاب کیا ہوئے
ہر کوچہ شعلہ زار ہے ہر شہر قتل گاہ
یک جہتئ حیات کے آداب کیا ہوئے
صحرائے تیرگی میں بھٹکتی ہے زندگی
ابھرے تھے جو افق پہ وہ مہتاب کیا ہوئے
مجرم ہوں میں اگر تو گنہگار تم بھی ہو
اَے رہبرانِ قوم خطا کار تم بھی ہو

(ساحرلدھیانوی)

جاگیرداری اور مارشل لاء

محمد عرفان

آج کل جناب الطاف حسین کی طرف سے جاگیرداروں کی سرزنش کے لئے کبھی نیک اور صالح فوجی جرنیلوں کو دعوت دینا اور کبھی عوام اور خصوصاً نوجوانوں کو انقلاب کی تیاری کرنے کے لئے متحد ہو جانے کی تلقین، موضوع بحث بنی ہوئی ہے۔ عوام تو شاید کمر توڑ مہنگائی اور آئے روز بجلی کی قیمتوں میں اضافہ کی وجہ سے زندگی کی survival میں اتنے الجھے ہوئے ہیں کہ وہ کسی بھی بیان کی طرف دیکھنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ لیکن لوئر مڈل کلاس اور مڈل کلاس کے نوجوان اور نظریاتی کنفیوژن کا شکار بائیں بازو، ان تمام بیانات کو شائد کچھ زیادہ ہی سنجیدہ لے رہا ہے۔ پاکستان کی سیاست کی تھوڑی بہت سمجھ بوجھ رکھنے والے اور ایم کیو ایم (مہاجر سے متحدہ) کی سیاسی تاریخ اور پس منظر والے سیاسی کارکنوں کے لئے یہ بیان باعث حیرت نہیں تھا۔ فوج کو جاگیرداروں کو ٹیکل ڈالنے کے لئے اور قرضے معاف کروانے والوں کا احتساب کرنے کے لئے مارشل لاء کی دعوت منتخب جمہوری حکومت میں بیٹھ کر دینا قابل مذمت ہی نہیں بلکہ قابل شرم بھی ہے۔ لیکن بعض دماغی لوڈ شیڈنگ کا شکار دانشوروں کے لئے پتہ نہیں کیوں ڈسکشن کا موضوع بنا ہوا ہے۔ الطاف حسین کی طرف سے فوج کو جاگیرداری ختم کرنے کے لئے اپنا رول ادا کرنے کی دعوت دینا باعث حیرت نہیں بلکہ یہ دعوت ایم کیو ایم کے ماضی، حال اور مستقبل کے سیاسی پروگرام اور تنظیمی ساخت کو سمجھنے کے لئے اہم ہے۔

اس بات میں کوئی دو رائے نہیں کہ پاکستان کا بنیادی مسئلہ جاگیرداری ہے۔ اور جاگیرداری ختم کئے بغیر اس ملک میں کسی بھی سماجی تبدیلی کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی ہے۔ جاگیرداری کے خاتمہ کے لئے پاکستان میں بائیں بازو نے تابناک جدوجہد کی ہے اور جاگیرداری نظام کے خاتمہ کے لئے کسانوں اور ہاریوں کو منظم کرنے میں بھرپور سیاسی کردار ادا کیا ہے۔ بعض این جی اوز نما دانشوروں اور نام نہاد قوم پرستوں کو آج جاگیرداری نظام نظر نہیں آ رہا ہے۔

بعض بائیں بازو کے دوستوں کی رائے جو اس سیاسی منظر نامے میں سے ابھر کر سامنے آئی ہے وہ یہی تھی کہ ہمیں جاگیرداری کے خاتمہ کے لئے ''الطاف حسین'' کا ساتھ دینا چاہئے اور نام نہاد جاگیرداروں پر مشتمل منتخب حکومت کی آڑ میں غیر دانستہ طور پر جاگیرداری کی حمایت سے باز آنا چاہئے۔

الطاف حسین کی طرف سے دئے گئے بیانات اور طاقت کے توازن میں جاری تضادات پر اپنی رائے بعد میں رکھتے ہیں پہلے ذرا اس بنیادی سوال پر غور کرتے ہیں کہ کیا فوج جاگیرداری کو ختم کر سکتی ہے؟ اور کیا عالمی سرمایہ دارانہ قوتیں (سامراج) پاکستان کو ایک صنعتی ملک دیکھنا چاہتی ہیں؟ جب قیام پاکستان کی تحریک چل رہی تھی اور مسلم لیگ میں یونینسٹ پارٹی کے جاگیرداروں کا شامل ہو کر 1946ء کے انتخابات میں اہم رول ادا کرنا ان طبقات کا نئے سیاسی منظر نامہ میں رول کو واضح کرتا ہے۔ اور دوسرا اس کے ساتھ ہی برطانوی سامراج کی طرف سے تشکیل کردہ معاشی کالونیل ڈھانچہ بھی سمجھنا ضروری ہے۔ اسی طرح قیام پاکستان کے وقت پاکستان کے حصے میں آنے والی فوج کی ہیت اور ساخت کو سمجھنا بھی ضروری ہے۔ برطانوی سامراج دو طرح کی فوج رکھتا تھا ایک تھی occupying army اور دوسری تھی advnacing army۔

Advancing Army کسی بھی ملک اور علاقے پر قبضہ کرنے کے بعد آگے گزر جاتی تھی جبکہ occupying army بعد میں اس علاقے میں قائم کئے گئے ڈھانچہ کی محافظ ہوتی تھی۔ پاکستان کے حصہ میں آنے والی آرمی اسی occupying army پر مشتمل تھی اور ہے۔ جس کا کام سامراج کی طرف سے دیئے گئے سیاسی، معاشی ڈھانچہ کی حفاظت کرنا تھا اور ہے۔ پاکستان کا معاشی ڈھانچہ کیا ہے؟ اس پر بات کرنے سے پہلے میں چاہوں گا کہ پہلے پرانی جاگیرداری اور کالونیل جاگیرداری میں فرق واضح کر دیا جائے تا کہ قاری کو سمجھنے میں آسانی رہے کہ برطانوی سامراج ہمیں ورثے میں کونسی جاگیرداری بطور معاشی ڈھانچہ کے دے کر گیا ہے اور اس معاشی ڈھانچہ سے وابستہ سامراجی مقاصد کیا تھے۔

اب تک ہمیں دو طرح کی جاگیرداری سے پالا پڑا ہے۔ ایک وہ جاگیرداری کی قسم جو برطانوی سامراج کے آنے سے پہلے یہاں کے زرعی سماج میں سے خود رو طریقے سے پیدا ہوئی اور دوسری قسم جاگیرداری کی وہ ہے جو یہاں برطانوی سامراج کے آنے کے بعد کالونیل طاقتوں نے اپنے مقاصد کے لئے پیدا کی۔ ان دونوں طرح کی جاگیرداری میں بہت فرق ہے۔ کالونیل جاگیرداری کو کالونیل طاقتوں نے اس علاقے کو اپنی منڈی بنانے کے لئے بنایا تھا۔ پاکستان بالخصوص پنجاب میں جس قسم کی جاگیرداری سے ہمارا واسطہ ہے وہ کالونیل دور کی جاگیرداری ہے۔

برطانیہ میں صنعتی انقلاب (جو نو آبادیوں کی لوٹ مار کا نتیجہ ہے) نے دو نئے طبقوں سرمایہ دار اور صنعتی مزدور طبقے کو جنم دیا۔ اس ابھرتے ہوئے سرمایہ دار طبقے نے برطانیہ کو زراعت پر جامد رکھنے والے طبقے (جاگیردار) کا خاتمہ کر دیا لیکن ساتھی ہی ساتھ انہوں نے اپنی مقبوضات کو زراعت پر جامد رکھ کر انہیں اپنی مصنوعات کی منڈی رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ یعنی یہاں کی آبادی اپنی زراعت سے جو کچھ کمائے وہ برطانوی مصنوعات خرید کر برطانیہ منتقل کر دے۔ اس سلسلے میں برطانوی سامراج نے دریاؤں پر ہیڈ ورکس بنا کر نہروں کا جال بچھایا اور زمین جاگیر کی صورت میں ان لوگوں کو عنایت کی گئی جن کی وفاداری 1857ء کی جنگ میں آزما چکے تھے۔ یہ نئے پیدا ہونے والے جاگیردار آگے چل کر برطانوی سامراج کے سیاسی اور معاشی مفادات کے نسل در نسل محافظ بننے والے تھے۔ برطانوی سامراج نے کالونیل جاگیرداروں کا طبقہ ہی پیدا نہیں کیا بلکہ انہیں ایک متبادل سیاسی قوت اور دوسرے درجے کے حکمران کے طور پر پروان چڑھایا۔

اگر ہم مجموعی طور پر کالونیل جاگیرداری کو (جسے الطاف بھائی فوج کی مدد سے ختم کرنا چاہئے ہیں) معاشی ڈھانچہ کے طور پر سامنے رکھیں تو اس معاشی ڈھانچہ کی حفاظتی قوتیں جو ہمیں نظر آتی ہیں ان میں پولیس کا نظام اور پھر عدلیہ کو پولیس کی تفتیش کا محتاج بنا کر انتظامیہ کے ماتحت کرنا، پیداواری عمل سے بیگانہ نظام تعلیم پر ایک ایسی فوج منظم کی گئی جو کالونیل جاگیرداری کی محافظ ہو۔ اور اگر نظام کو کہیں سے خطرہ محسوس ہوتا ہے تو فوج نگران کے طور پر نظام کو بچانے کے لئے اپنا رول ادا کرتی ہے۔ یہ تمام ادارے برطانوی سامراج ہمیں ورثہ میں دے کر گیا ہے تا کہ یہ ادارے بعد میں اپنا تاریخی کردار ادا کریں اور ہمیں ورثہ میں ملے کالونیل معاشی ڈھانچہ کو مجہول معیشت پر مرتکز رکھیں۔ تا کہ ہم

سامراجی سرمایہ داری (سامراج) کی منڈی رہیں اور ایک consumer society کا رول ادا کرتے رہیں۔

پاکستان کی سیاسی تاریخ میں فوج نے ہمیشہ اس کالونیل جاگیرداری کو بچانے کے لئے اپنا تاریخی کردار ادا کیا ہے۔ مختلف مارشل لاؤں میں اسی جاگیرداری کو تحفظ دیا گیا ہے اور تمام فوجی ادوار میں انہی بڑے جاگیرداروں کے بڑے بڑے قرضے معاف کئے ہیں۔ حتیٰ کہ 1970ء کے الیکشن کے بعد عوامی لیگ کی قیادت کی طرف سے جاگیرداری کے خلاف کوئی قدم اٹھائے جانے کے ڈر سے اس ملک کو دولخت کر دیا گیا تا کہ اس معاشی ڈھانچہ کو بچایا جا سکے۔ ضیاء الحق کے دور حکومت میں عدلیہ کی طرف سے زرعی اصلاحات کو غیر شرعی قرار دلوانا اس ادارے کی اپنے مقاصد کے ساتھ وفاداری کا واضح ثبوت ہے۔

قیام پاکستان کے بعد سے ابھرنے والے منظر نامے میں ہمیں ویسے بھی فوج اور فوجی جرنیل ایک غیر حاضر جاگیردار اور قبضہ گروپ کی شکل میں واضح طور پر متحرک نظر آتے ہیں۔ اوکاڑہ ملٹری فارم اور دوسرے ملٹری فارم مزارعین کے ساتھ تنازعہ اس کا واضح ثبوت ہے۔

اس تمام منظر نامے کو ذہن میں رکھیں تو یہ سوال ابھرتا ہے کہ کیا فوج جاگیرداری کے خلاف کوئی رول ادا کر سکتی ہے؟ کیا فوج انگریز کے بنائے ہوئے جاگیرداری نظام اور فوجی جرنیلوں کی غیر حاضر زمینداری کے خلاف کوئی فیصلہ کن رول ادا کر سکتی ہے؟

دوسرا اہم نقطہ سرمایہ داری کا جو سامراجی شکل میں اپنے پنجے گاڑھے ہوئے ہے کیا وہ پاکستان میں جاگیرداری کا خاتمہ چاہتی ہے؟

اگر اب سامراج اپنا وجود نہیں رکھتا (جیسا کہ بعض دانشوروں کے نزدیک سامراج کا وجود ختم ہو گیا ہے اور اب عالمی سرمایہ داری کے مفادات تبدیل ہو گئے ہیں وغیرہ وغیرہ) تب بات سمجھ آتی ہے کہ عالمی سرمایہ داری اب غیر ہموار ترقی کے ماڈل سے باہر آ کر یکسانیت پر مبنی ترقی دیکھنا چاہتی ہے اور اس مقصد کے لئے وہ جاگیرداری کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن اگر سامراج کا وجود ہے (جیسا کہ ہے) تو پھر سامراجی سرمایہ داری کا مفاد اس خطہ کو اپنی منڈی رکھنا مقصود ہے۔ اپنی مصنوعات کی منڈی برقرار رکھنے کے لئے وہ کبھی بھی جاگیرداری کا خاتمہ نہیں چاہیں گے۔

اب سوال یہ ابھرتا ہے کہ اس جاگیرداری کو ختم کرنے کے لئے تبدیلی کی قوتیں کونسی ہیں؟ کالونیل فوج/ سامراجی سرمایہ داری سے اس بنیادی سماجی تبدیلی کی توقع رکھنا سیاسی ناپختگی کا مظاہرہ ہوگا اور اس فوجی افسر شاہی کے نمائندہ سیاستدانوں کے بیانات پر بحث میں اپنا ٹائم ضائع کرنا تاریخی جرم ہوگا۔ اس لئے آج ضرورت ہے کہ ہم جاگیرداری کے خاتمہ کے لئے ان تاریخی قوتوں کو منظم کریں جو بنیادی طور پر اس سماجی تبدیلی کا جوہر رکھتی ہیں۔ وہ قوتیں ہیں اس ملک کے محنت کار عوام، دانشور، طلبہ، شہری تاجر طبقہ، درمیانہ کسان اور ہاری۔ جاگیرداری اس وقت تک ختم نہیں ہو سکتی جب تک ان طبقات کو ایک سیاسی شناخت میں متحد نہیں کیا جاتا۔

رہی بات الطاف حسین کے جاگیرداری کے خلاف بیانات کی تو حالیہ سیلاب کے بعد اندرون سندھ میں سے متاثرین کو کراچی میں بسانے کے بعد سیاسی حلقہ بندیوں میں طاقت کے توازن کی تبدیلی کو رکوانے سے زیادہ کچھ نظر نہیں آتا۔ جب کہ جاگیرداری کے خاتمہ کے لئے الطاف حسین صاحب اتنے سنجیدہ ہیں کہ اپنا سارا پچھلہ tenure سندھ کے بڑے جاگیردار ارباب رحیم اور سید قائم علی شاہ کے ساتھ enjoy کیا۔ بیانات میں شدت صرف اس وقت آتی ہے جب لوٹ مار کے حصہ میں کمی کا خدشہ ہوتا ہے۔

نوٹ: ایم کیو ایم نے اس تحریر کے بعد جاگیرداری سے متعلق بل پیش کیا۔

☆☆☆☆☆

بقیہ: یوسف حسن

حقیقی کمیونٹی کا اور افراد کی بحیثیت افراد انفرادیت کا اثبات ہے اور افراد کے اس اثبات کی مقررن (concrete) صورت کیا ہو سکتی ہے، اس کے متعلق مارکس اور اینگلز کی تحریروں میں کچھ نکات واضح طور پر موجود ہیں۔

مارکس اور اینگلز کمیونزم کو تاریخ کی حرکت قرار دیتے ہیں۔ جس کے کچھ تجربے (Empirical) آثار خود ترقی یافتہ صنعتی سرمایہ داری میں پہلے موجود ہوتے ہیں جو نظریاتی (Theoretical) موقف کی بنیاد بنتے ہیں۔ مثلاً فرد اور اسکی انفرادیت کے حوالے سے مارکس نے 'سرمایہ' جلد سوم میں لکھا ہے کہ ''سرمایہ'' پس سرمایہ انفرادیت کی نشو ونما کے لیے مادی احوال تخلیق کرتا ہے جو جس طرح اپنی پیداوار میں ہمہ پہلو ہوتی ہے اسی طرح اسکے اصراف میں بھی ہمہ پہلو ہوتی ہے''

مارکس اور اینگلز ''جرمن آئڈیالوجی'' میں لکھتے ہیں کہ ''آلات پیداوار کی کلیت (Totality) پر تصرف خود افراد میں اپنی استعدادوں کی کلیت کی نشو ونما ہے'' اور ''صرف کمیونٹی میں دوسروں کے ساتھ ہر فرد اپنی صلاحیتوں کو ساری سمتوں میں ترقی دینے کے وسائل رکھتا ہے۔ چنانچہ صرف کمیونٹی میں شخصی آزادی ممکن ہے''

جزوی یا کسری فرد Detailed individual کے مقابلے میں کلی فرد (Total individual) یا کامل فرد (Complete individual) کا اثبات مارکس کا ایک مستقل مسئلہ ہے اور وہ یہ اثبات کمیونزم میں دیکھتا اور دکھاتا ہے۔

ہمارے وطن پاکستان میں نہ ہی کمیونزم یا سوشلزم اور بالائی کمیونزم کی تاسیس وتشکیل کے معروضی وموضوعی احوال فوری طور پر موجود ہوں یا نہ ہوں، ہم ترقی پسندوں پر لازم ہیں کہ اس میں فرد کی انفرادیت اور اس کی ہمہ پہلو آزادانہ نشو ونما کا جو اعلیٰ منصب اور احسن پیش کیا گیا ہے، اُسے اپنے محنت کش عوام کے سامنے پیش رکھیں اور اس عمومی نظریاتی مغالطے کو ذہنوں سے نکالنے کی کوشش کریں کہ کمیونزم میں فرد اور اس کی انفرادیت کی نفی ہوتی ہے۔

☆☆☆☆☆

کمیونزم میں فرد اور اس کی انفرادیت کی اہمیت

یوسف حسن

غیر ترقی پسندوں کے ساتھ ہمارے ترقی پسند بھی عام طور پر اس نظریاتی مغالطے میں مبتلاء ہیں کہ کمیونزم میں فرد بحیثیت فرد کوئی اہمیت نہیں رکھتا اور اس کی انفرادیت جمعیت کی کُلیت (totality) میں فنا ہو جاتی ہے یا فنا ہو جانی چاہئے۔

ہمارے غیر ترقی پسند اپنے اس نظریاتی مغالطے کو کمیونزم کا ایک حقیقی مگر منفی نظریاتی لازمہ سمجھ کر اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ اور ہمارے ترقی پسند بھی اپنے اس نظریاتی مغالطے کو کمیونزم کا ایک حقیقی مگر مثبت نظریاتی لازمہ جان کر اسکی موافقت کرتے ہیں۔

اس طرح غیر ترقی پسند اور ترقی پسند دونوں اپنے اس مشترکہ نظریاتی مغالطے کو کمیونزم کا ایک حقیقی نظریاتی لازمہ مان کر اس پر بظاہر ایک دوسرے سے متضاد رویوں کا اظہار کرتے ہیں۔ لیکن دونوں ہی اپنے ان بظاہر متضاد رویوں کے ساتھ اصل میں ایک ہی کام کرتے ہیں اور وہ ایک ہی کام یعنی کمیونزم میں فرد کی بحیثیت فرد اور اس کی انفرادیت کی اہمیت کو حقیقی نظریاتی لازمے کو مسخ کر کے پیش کرنے کا ہے۔

اس نظریاتی مغالطہ زدگی کی عمومی صورت حال میں بر سبیل تذکرہ، یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے کہ ہمارے اعلیٰ تعلیم یافتہ ترقی پسند ساتھیوں میں سے سید شبیر حسین شاہ کے مضمون بعنوان ''اشراکیت اور صوفی ازم کے اشتراکات'' (مطبوعہ عوامی جمہوریت جولائی 2010ء) میں بھی اسی نظریاتی مغالطے کا ان کے مثبت رویے کے ساتھ اظہار ملتا ہے۔

''یہاں ایک سوال اشتراکی کے ضمن میں بھی بڑا اہم ہے کہ اگر اشتراکیت کا مرحلہ برپا ہو جاتا ہے اور اقتدار پرولتاری ڈکٹیٹرشپ سے ایک نان سٹیٹ سوسائٹی کے ہاتھ چلا جاتا ہے اور مارکسی انقلاب اپنی اعلیٰ منزل سے سرفراز ہوتا ہے تو کیا اشتراکی اپنے میں مدغم ہو کر اپنے وجود سے دستبردار ہو جاتا ہے جس طرح صوفی خدا میں مدغم ہو کر اپنے وجود سے دست بردار ہو جاتا ہے۔ اپنے عروج کی اس مکینکس میں جو اشتراک پایا جاتا ہے، بھلے وہ نوعیت اور ساخت کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہے مگر وہ اپنے رجحان میں یہ صوفی اور اشتراکی کا واحد اشتراک ہے۔ تو کیا ہم کہیں گے کہ صوفی اور اشتراکی کا حتمی طور پر جس جُہد مسلسل میں ہیں وہ دراصل اپنے وجود کو کسی اور وجود میں ڈھالنے کی جدوجہد ہے''۔ (ص۔17)

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ آیا کمیونزم کے بانی مفکرین مارکس اور اینگلز بھی ریاست اور طبقات کی نفی کے ساتھ افراد اور ان کی انفرادیت کی بھی نفی کرتے ہیں یا ان کا اثبات کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنی مشترکہ تصنیف ''جرمن آئڈیالوجی'' میں ریاست کو فریب دہ کمیونٹی (Illusory community) قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ:

''ریاست وہ ہیئت ہے جس میں ایک حکمران طبقے کے افراد اپنے مشترکہ مفادات منواتے ہیں۔''

زیریں کمیونزم (lower communism) یا سوشلزم کے پہلے مرحلے میں حکمران پرولتاری طبقے کے افراد بھی ریاست کی ہیئت میں اپنے مشترکہ مفادات منواتے ہیں۔

بالائی کمیونزم (higher communism) سوشلزم کے دوسرے مرحلے میں ریاست اور طبقات دونوں کی نفی کی جاتی ہے۔ یہ نفی کس کے اثبات کی خاطر ہے؟ مارکس اور اینگلز پرولتاریوں کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''چنانچہ انھیں اپنے آپ کو افراد کی حیثیت سے منوانے کی غرض سے ریاست کو لازماً ختم کر ڈالنا چاہئے''۔

انھوں نے کمیونسٹ سوسائٹی کے لئے کمیونٹی، حقیقی کمیونٹی اور انقلابی پرولتاریوں کی کمیونٹی کے الفاظ استعمال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''حقیقی کمیونٹی میں افراد اپنی معاونت (association) میں اور اس کے ذریعے اپنی آزادی حاصل کرتے ہیں۔''

گویا ریاست یا فریب دہ کمیونٹی کی نفی کے ساتھ آزاد افراد کی رضا کارانہ باہمی معاونت پر مبنی حقیقی کمیونٹی کا اثبات ہونا ہے اور پرولتاریوں کے طبقے سمیت سارے طبقات کی نفی کے ساتھ افراد اور ان کی انفرادیت کا اثبات ہوتا ہے۔ مارکس اور اینگلز کی تحریروں سے حوالہ بالا اقتباسات، کمیونزم خصوصاً بالائی کمیونزم میں فرد کی اہمیت کی بابت عمومی نظریاتی مغالطے کی ایک بر سبیل تذکرہ آنے والی خصوصی مثال کو بے بنیاد ثابت کرتے ہیں۔

مضمون نگار کی یہ بات البتہ درست اور کمیونزم کے بارے میں مارکس اور اینگلز کی فکر کے عین مطابق ہے کہ

''شاید کسی اشتراکی نے یہ سوچا ہے کہ نظام کا دھڑن تختہ کرنے کے لئے دین کی نفی ضروری ہے، یہاں اس نے غلطی کی ہوگی'' (ص۔15)

اس حوالے سے مارکس نے اپنے ''معاشی و فلسفیانہ مسودات 1844'' میں اپنا موقف نہایت وضاحت سے تحریر کیا ہے کہ ''سوشلزم انسان کی مثبت خود آگہی ہے، اب مذہب کے خاتمے کے ذریعے متوسط (mediated) نہیں ہے''۔

اس نے انٹرنیشنل ورکنگ مینز ایسوسی ایشن المعروف پہلی انٹرنیشنل (1876-1864) میں اپنے اسی موقف کو دہرایا اور منوایا۔ کمیونزم مذہبی اور لامذہبی، صوفی اور غیر صوفی کی تفریق کے بغیر پرولتاری طبقے کا نظریاتی موقف ہے اور کمیونزم مذہب کے خاتمے یا الحاد سے ہرگز مشروط نہیں و موسوط نہیں ہے۔

بالائی کمیونزم جسے عام طور پر صرف کمیونزم کہا جاتا ہے کی لازمی سیاسی معاشی بنیاد انتہائی ترقی یافتہ پیداواری قوتیں یعنی ذرائع پیداوار (آلات محنت اور معروضات محنت) اور پیدا کار یعنی خود انسان اور ان کی مطابقت میں پیداواری رشتے (پیداوار کے سلسلہ عمل (process) پیداوار کی تقسیم اور پیداوار کے اصراف کے رشتے) ہیں اس بنیاد پر

ذرائع پیداوار کی نجی ملکیت کا خاتمہ؛

ریاست کا خاتمہ؛

طبقات کا خاتمہ؛

سماجی محنت کی تقسیم کا خاتمہ؛ اور

گاؤں اور شہر میں فرق کا خاتمہ؛

کیا جاتا ہے۔ اس ہر نفی کے ساتھ ایک اثبات ہے۔ آخر یہ سارے اثبات کس کے حق میں ہیں اور ان کی ممکنہ یا متوقع صورتیں کیا ہیں؟ عمومی طور پر یہ سارے اثبات افراد کی

باقی صفحہ نمبر 14 پر

جمہور دشمن جمہوریت چہ معنی دارد؟

غلام دستگیر محبوب

کہا جاتا ہے کہ لُولی لنگڑی جمہوری آمریت سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ اس سنہرے خیال کی بنیاد پر جمہوری سسٹم جاری رکھنے کی وکالت کی جاتی ہے اور دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اسی جمہوری تسلسل کے بطن سے صاف ستھرا معاشرہ تخلیق پائے گا اور وسائل کی عام آدمی تک رسائی ممکن بنالی جائے گی۔ بنیادی ضروریات زندگی عوام کی دہلیز پر پہنچانے کی یہ منطق ہمارے ملک میں دہائیوں سے برسر اقتدار گروہ پیش کرتے چلے آرہے ہیں۔ وسائل کی عام آدمی تک رسائی نزدیک آنے کی بجائے دور ہوتی چلی جارہی ہے۔ حکمران جمہوریت کی فیوض و برکات سے متعلق لیکچر دیتے کبھی نہیں تھکتے۔ ادارے بنانے اور انہیں مستحکم کرنے کی باتیں آئے روز ہوتی ہیں، سسٹم کے تقدس کی دہائیاں دی جاتی ہیں۔۔۔۔ ایک دوسرے کو ڈرانے کے لئے انارکی اور خونی انقلاب کے ڈراؤنے خواب دکھائے جاتے ہیں۔۔۔۔ انہیں آج تک یہ خیال نہیں آیا کہ ان کے کھوکھلے نعرے اور بے جان الفاظ عوام کے کسی درد کا درمان نہیں بن سکے۔ عوام کو روزگار کی ضمانت نہیں دے سکے۔

آمرانہ دور میں ہمیشہ آئین کا حلیہ بگاڑ دیا جاتا ہے۔ عوام کے آئینی و جمہوری حقوق کا راستہ روک دیا جاتا ہے۔ جمہوری حقوق غصب کر لئے جاتے ہیں۔ موجودہ حکومت نے آئین پاکستان کو اس کی اصل روح کے مطابق بحال کرنے کے لئے جب ایک آئینی کمیٹی بنانے کا اعلان کیا تو پریس اور میڈیا میں عوام کو کئی ماہ تک خوشخبریاں سنائی گئیں کہ اس بار جمہوریت مکمل بحال ہو جائے گی اور مشرف سمیت تمام آمروں کے ادوار میں کی گئی عوام دشمن ترمیمیں ختم کر دی جائیں گی اور آئین اپنی روح کے مطابق بحال ہو جائے گا اس اس طرح جمہوریت کی گاڑی پٹڑی پر چڑھ جائے گی۔

آئینی کمیٹی کی سفارشات پر مبنی ترامیم جن کو پارلیمنٹ نے منظور کر لیا ان کی رُو سے عوامی فلاح اور حاکمیت کے نام پر باہمی مفادات کے تحفظ کا معاہدہ تشکیل پا گیا ہے۔ ریاستی اقتدار پر حکمرانوں نے اپنی طبقاتی گرفت کو مضبوط تر کرنے کی کوشش کی ہے۔ سیاست میں شخصیت پرستی اور وراثت کی مکروہات کو پسندیدگی کی سند عطا کر دی گئی ہے۔ جو بدلنا ضروری تھا نہیں بدلا۔ اگرچہ وزیراعظم کو بااختیار بنایا گیا ہے لیکن پارلیمنٹ کے باہر بیٹھے فردِ واحد کے ہاتھ نے پارلیمنٹ کی اس سعی کی نفی کر دی ہے۔ کون سی بنیادی تبدیلی لائی گئی ہے؟ وہی پرانی بے ڈھنگی چال، کیا یہی جمہوریت ہے؟

مجرد تصورات، مذہب اور سیاست کا جھیڑا وہیں کا وہیں، ملکی معیشت میں جاگیرداروں کا کلہ قائم، صنعت کاروں، تاجروں، مڈل مینوں، نوسرباز، جگاڑیوں کی اجارہ داری ویسی کی ویسی، ملائیت بھی وہی، دہشت گردی بھی اسی طرح، امریکہ بہادر کی غلامی، آئی۔ایم۔ایف۔، ورلڈ بنک کا شکنجہ پہلے سے زیادہ سخت، یہ تو کچھ بھی نہیں بدلا۔ تبدیلی تو آئی ہے مگر کونسی؟ وسائل پر قابض مٹھی بھر طالع آزماؤں اور وسائل سے محروم عوام کے درمیان فرق اور زیادہ گہرا اور واضح ہو گیا ہے۔ مہنگائی کے جن نے عام آدمی کی پسلیاں تک مروڑ دی ہیں۔ ایک بار پھر تبدیلی کی باتیں زور و شور سے کی جارہی ہیں، روائتی طور پر ڈکٹیٹروں کا ساتھ دینے والے اکٹھے ہو رہے ہیں۔ مغربی پریس میں خبریں اور مضامین آنا شروع ہو گئے ہیں۔ ایک مشہور غیر ملکی ویب سائٹ نے تو ایک مضمون شائع کر دیا ہے جس کا عنوان ''Vultures are circling in Pakistan'' ہے۔ اس مضمون میں پاکستانی سیاستدانوں کو برملا ''ووچر'' یعنی گِدھوں سے تشبیہہ دی گئی ہے۔ سماجی اور اداراجاتی بنیادی تبدیلی کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا مگر اس تبدیلی کا انحصار دو تین بنیادی نوعیت کے سوالوں کے ساتھ نتھی ہے۔ اوّل یہ کہ یہ تبدیلی کا نعرہ لگانے والے بتائیں کہ تبدیلی سے ان کی مراد کیا ہے؟ دوئم یہ کہ تبدیلی سسٹم میں لائی جاسکتی ہے یا سٹرکچر میں اور اس کے خدوخال کیا ہوں گے اور وہ کون طے کرے گا؟ سوئم یہ کہ حقیقی تبدیلی کیسے لائی جاسکتی ہے اور یہ کون لائے گا، پھر یہ بھی کہ تبدیلی کے وارث کون ہوں گے، سیاستدان یا غیر سیاسی قوتیں؟

جمہوری ریاست کے تین اہم ستونوں کا مختصر تذکرہ زیر بحث موضوع سے متعلق دلچسپی کا باعث ہے۔

1۔ پارلیمنٹ: پارلیمنٹ جو جمہوری طرزِ حکمرانی کا مقدس ترین ادارہ ہے۔ اس کا کام ملک و ملت کے وقار کی نگہداشت، عوام کے مفادات کا تحفظ اور کروڑوں غریب عوام کے حقوق کے لئے قانون سازی کرنا ہے۔ ہمارے ہاں اس کے برعکس پارلیمنٹ نے نوابوں، جاگیرداروں، وڈیروں، صنعت کاروں، سرمایہ داروں، سیاست دانوں اور بیوروکریٹس کا تحفظ کرنے کی قسم کھا رکھی ہے۔ آج تک اس ایوان نے غربت، بے روزگاری، لاقانونیت اور سستے انصاف کی فراہمی کے لئے کوئی قرارداد یا ترمیم منظور نہیں کی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مقدس ایوان نے غریب عوام کے حقوق کے لئے کوئی ایک اجلاس تک منعقد نہیں کیا ہے۔ ان کا کام ذاتی اور اپنی پارٹیوں کی قیادت کے مفادات کے تحفظ اور مخالفین پر کیچڑ اچھالنے کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ کیا یہ ادارہ عام شہریوں کی خواہشات اور ضرورتوں کو اسی طرح روندتا رہے، قائم بھی رہے اور جس کی ایک گھنٹہ کاروائی پر 36 لاکھ روپے خرچ ہوں اور یہ ادارہ طاقتوروں کو مزید طاقت اور مظلوموں کو مزید مظلوم کرتا رہے؟

2۔ عدلیہ: دوسرا مقدس ادارہ عدلیہ کا ہے۔ اس ملک کے عام شہریوں اور سول سوسائیٹی نے وکلاء کے ہمقدم ہو کر عدلیہ کی آزادی کے لئے کمال کر دکھایا۔ کیا آج ہمارے ملک کا نظامِ عدل عام شہریوں کو اپنے عمل سے اعتماد کی فضا بحال کرنے میں کامیاب ہوا ہے یا اس دلیرانہ جدوجہد کے ثمرات کا یقین دلانے میں۔ ایسا ہوتا تو دکھائی نہیں دیتا۔ عام شہریوں کے لئے عدالتوں سے انصاف پہلے کی طرح مفقود ہے۔ وکیل کی فیس بھری نہیں جاتی، سالوں تک تاریخیں بھگتنا پڑتی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ طاقتور مافیا کے مقابلے میں عام شہری نہ تو نامی گرامی وکیل کرسکتا ہے، نہ بھاری فیسیں ادا کرسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عوام کی بہت بڑی اکثریت انصاف سے محروم تھی اور آج بھی ہے۔

3۔ افواج پاکستان: ہمارا تیسرا اہم ترین اور سب سے زیادہ طاقتور اور منظم ادارہ فوج ہے۔ آئینی لحاظ سے آرمی چیف محکمہ دفاع کے سیکرٹری کے ماتحت ہوتا ہے۔ وہی اس کا تقرر نامہ صدر اور وزیراعظم کی رضامندی سے جاری کرتا ہے۔ جب کہ تقرر کئے جانے کے بعد آرمی چیف اتنا اہم عہدہ بن جاتا ہے کہ حکومتیں اور اپوزیشن اس کے سہارے کی محتاج نظر آنے لگتی ہیں۔ عام شہری یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ کون کس کا ماتحت ہے؟

آرمی چیف بڑا ہے، وزیراعظم طاقت کا سرچشمہ ہے یا صدر؟ ہماری فوج کی ذمہ داریاں کیا ہیں۔ الیکشن کرانا، جمہوریت بچانا، عدالتی فیصلوں پر عمل کرانا فوج کا کام ہے یا وطنِ عزیز کی سرحدوں کا دفاع اور پیشہ ورانہ فرائض کی ادائیگی۔ اگر ایسا نہیں ہے تو ہمارے ملک کا ہر بڑا عہدیدار اور مقتدر ادارہ فیصلوں سے قبل راولپنڈی کی طرف کیوں دیکھتا ہے؟ ہر بڑی سیاسی جماعت جی بھر کر اپنے مخالفین کا بینڈ بجاتی نظر آتی ہے مگر فوج کے ساتھ تعلقات کو اپنا پلس پوائنٹ سمجھتی ہے۔ خفیہ ملاقاتیں ہوتی ہیں اور بہ بانگِ دُہل کہا جاتا ہے کہ ہمارے آرمی چیف سے بہت اچھے مراسم ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان تینوں اہم ترین اداروں کو مضبوط اس لئے بنایا جائے کہ وہ اوپر بیان کی گیا کھیل تماشہ جاری رکھیں۔ اسی طرح عوام کا خون چوستے رہیں، ان کی ہڈیاں مہنگائی کی چکی میں پستی رہیں اور ''جمہوریت'' کا سفر جاری رہے۔

پڑوسی ملک ہندوستان میں جمہوری سفر کا جائزہ دلچسپی کا باعث ہے۔ جمہوری سفر کو جاری رکھنے اور سماجی تبدیلی کے ایجنڈا پر بھارتی حکمرانوں نے ایک کمیشن تشکیل دیا تھا جس کا نام ''منڈل کمیشن'' تھا۔ منڈل کمیشن کی رپورٹ کچھ عرصہ تک توجہ حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہوسکی۔ تاہم حکومتی تبدیلی کے ایک مرحلہ پر ہندوستان کے وزیراعظم وی پی سنگھ نے فیصلہ کرلیا کہ منڈل کمیشن رپورٹ کو کابینہ کمیٹی کے اجلاس میں زیر بحث لایا جائے۔ کابینہ کے اجلاس میں رپورٹ پر بحث کے دوران ایک حکومتی وزیر نے کہا کہ اگرچہ کمیشن کی رپورٹ کے مندرجات بہت مثبت ہیں مگر ہمیں عجلت سے کام نہیں لینا چاہئے۔ جمہوریت کا سفر جاری رہے اور اس کے تسلسل سے خود بخود جمہوریت کے ثمرات عوام تک پہنچ جائیں گے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ عوام میں بیداری کا عمل تیز تر ہوتا چلا جائے گا۔ وزیراعظم وی پی سنگھ نے اپنے اس وزیر کو فوراً ٹوک دیا اور کہا کہ ''اچھی فصل تیار کرنے کے لئے مناسب وقت اور اچھے بیج کا انتخاب ضروری ہے۔ ہمیں پہلا قدم درست سمت میں اٹھانے میں دیر نہیں کرنی، بصورت دیگر یہ سفر مشکل اور ناممکن ہوتا چلا جائے گا۔ اور سینکڑوں سال سعی لا حاصل میں گزر جائیں گے۔ بھارتی حکمرانوں کی جمہوریت اور جمہوری حقوق سے متعلق مثبت پیش رفت سے ہی بھارت آمریت کے سایوں سے بچتا چلا آرہا ہے۔

وطنِ عزیز میں جمہوری معاشرہ کے تین اہم ستونوں کا مختصر جائزہ سے یہ حقیقت اخذ کرلینا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ جمہوریت نام ہے جمہور کا۔ جمہور کے بغیر جمہوریت کوئی معنی نہیں رکھتی۔ ہمارے ہاں جرائم، لوٹ مار اور کرپشن کو سیاست کا تحفظ اور سیاست کو جرائم اور لوٹ کھسوٹ جاری رکھنے کی ضمانت کی 63 سالہ تاریخ ہے۔ یہاں یہ حقیقت بھی واضح کردینا غیر اہم نہ ہوگا کہ عام انتخابات میں طاقتور ترین ریاستی ستون فوج اگر صدق دل سے غیر جانبدار ریفری بن جائے اور عوام کو جمہوریت کا تحفہ اگر دینا بھی چاہئے تو یہ عملاً اس کے لئے ناممکن ہوگا۔ عام انتخابات سو فی صد فیئر اور فری ہو بھی جائیں تو نتیجے کے طور پر جو کچھ موجودہ قوانین کے تحت برآمد ہوگا وہ ہرگز ہرگز جمہوریت نہیں ہوگی۔ جب تک کرپٹ سیاستدان، بے رحم جاگیردار، طالع آزماء جرنیلی ٹولہ، سازشی اور کرپٹ وخودغرض بیوروکریٹ راتوں رات کھرب پتی بن جانے کے خواہشمند تاجر اور سرمایہ دار جو کہ 63 سال سے قابض ہیں کو بدل کر 95 فیصد عوام کے حقیقی نمائندے پارلیمنٹ میں نمائندگی حاصل نہیں کرتے اور عام انتخابات آزادانہ ماحول میں سرمایہ کی ریل پیل اور دھونس دھاندلی سے پاک نہیں ہو جاتے موجودہ ''جمہوریت'' کا یہ سفر جاری رہے گا۔

صبح کے لشکر نکلنے والے ہیں

پناہ لیتا ہے جن مجلسوں میں تیرہ نظام
وہیں سے صبح کے لشکر نکلنے والے ہیں

ابھر رہے ہیں فضاؤں میں احمریں پرچم
کنارے مشرق و مغرب کے ملنے والے ہیں

ہزار برق گرے، لاکھ آندھیاں اٹھیں
وہ پھول کھل کے رہیں گے جو کھلنے والے ہیں

(ساحر لدھیانوی)

متحرک معاشرہ

مہر وقار حسین

کسی بھی ملک اور معاشرے کی ترقی استحکام اور خوشحالی میں اس بات کو بڑا دخل ہوتا ہے کہ اس کی انسانی طاقت man power کو کس طرح استعمال کیا جاتا ہے۔ معاشرہ چاہے کس قدر بھی سائنٹفک اور ٹیکنالوجی میں ترقی یافتہ کیوں نہ ہو، اس کو منظم کرنے اور اس کو چلانے کے لئے انسانی ذہن اور انسانی توانائی کی ضرورت ہوتی ہے۔

اگر معاشرے کی تمام انسانی قوت کو استعمال کیا جائے گا تو اس صورت میں معاشرہ متحرک رہے گا۔ لیکن اگر انسانی طاقت عمل اور غیر عمل میں تقسیم ہو جائے تو اس صورت میں اس کی ترقی بھی غیر مساوی ہو جائے گی۔ کیونکہ اس صورت میں وہ تمام افراد حرکت کے عمل میں شریک نہیں ہیں، بے روزگار ہیں اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔ یہ لوگ پھر یا تو پیداوار کی زائد مقدار کو استعمال کر کے اسے ہضم کریں گے اور اگر یہ زائد مقدار نہیں تو زبردستی یہ دوسروں کے حصے میں شریک ہوں گے اور اس طرح خود اور دوسروں کو بھی بھوکا رکھیں گے۔ انسانی طاقت کو کس طرح سے استعمال کیا جائے یہ بھی ایک اہم مسئلہ ہے۔ کیونکہ اگر اسے ان کاموں منصوبوں میں استعمال کیا جائے کہ جہاں نتائج کچھ نہ نکلے اور یہ پیداوار عمل کو آگے نہ بڑھا سکیں تو اس صورت میں یہ توانائی ضائع ہو جاتی ہے۔

اس تشریح کے بعد اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم اپنے معاشرے کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ ہمارے ہاں انسانی توانائی کا استعمال کیسے ہو رہا ہے۔ سب سے پہلے جو چیز ہمارے سامنے آتی ہے وہ ہمارا فرسودہ جاگیردارانہ نظام ہے کہ جس میں اس توانائی کا غلط استعمال ہو رہا ہے۔ مثلاً ایک زمیندار کی خدمت کے لئے آٹھ سے دس ملازم ہوتے ہیں جن کے ذمہ اس کے چھوٹے چھوٹے احکامات کی تکمیل کرنا ہوتا ہے۔ اکثر اس کی بیٹھک پر پندرہ بیس کسان صبح سے شام تک بیکار بیٹھے رہتے ہیں کہ وہ جب بھی باہر آئے تو اسے سلام کریں اور اس طرح اس کی خوشنودی حاصل کریں۔ اسی طرح حکومت کے دفاتر ہیں، ہر افسر کی صورتحال بھی یہی ہے۔ اس کے بعد بیروزگاروں کی بڑی تعداد ہے جو ملازمت اور روزی کی تلاش میں اپنی توانائی ضائع کرتے ہیں اور اکثر مایوس ہو کر سستی، کاہلی اور نا اُمیدی کا شکار ہو کر خودکشیوں پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ شہروں میں ان عورتوں کی بڑی تعداد ہے کہ جنہیں گھروں میں بند رکھا جاتا ہے۔ اور ان کی صلاحیتوں کو محض کھانا پکانا اور دیگر گھریلو کام کاج میں لگا دیا جاتا ہے۔ کیونکہ سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ انسانی قوت کو تربیت دے کر اسے زمانے کی ضرورت کے مطابق استعمال کیا جائے کیونکہ اب جسمانی توانائی سے سارے کام نہیں ہوتے اس کے لئے ضروری ہے کہ ایک ایسا نظام تعلیم تشکیل دیا جائے جو افراد کو ذہنی و جسمانی دونوں طرح سے اس بات پر تیار کرے کہ وہ سائنس اور ٹکنالوجی اور سماجی علوم میں کام کر سکیں۔ ہمارے ہاں اس پر اس لئے عمل نہیں ہو رہا کیونکہ تعلیم حاصل کرنے اور اپنی صلاحیتوں کو استعمال کرنے کے مواقع ہر ایک ہو حاصل نہیں۔ وہ طبقے جن کے پاس وسائل ہیں وہ ان سہولتوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں مگر ضروری نہیں کہ ذہانت اور تخلیقی صلاحیت بھی ان کے پاس ہو۔ اس لئے وہ لوگ کہ جن کے پاس مادی وسائل نہیں ہوئے وہ ایک جگہ ٹھہر کر رہ جاتے ہیں اور ان کی صلاحیتیں اور ان کی ذہانت ابھرنے نہیں پاتیں۔

انسانی قوت اور توانائی کو کارگر کرنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہمیشہ متحرک رہے۔ اگر اس میں ٹھہراؤ آ جائے گا تو اس کے ساتھ ہی پیداواری عمل رک جائے گا۔ اس لئے ضروری ہے کہ معاشرے کے اداروں کو اس انداز سے ترتیب دیں اور اس کو اس طرح تشکیل کریں جس میں ہر فرد برابر کام میں مصروف رہے اور اس کو یہ احساس نہ ہو کہ اس کا وجود بے کار ہے یا اس کے بغیر بھی کام چل سکتا ہے۔ کیونکہ جب ہر فرد کام کے عمل میں پوری طرح سے خود کو الجھائے گا نہیں اس وقت تک اس کی کام سے دلچسپی اور یگانگت پیدا نہیں ہوگی اور اس کے بغیر ترقی کا عمل آگے نہیں بڑھے گا۔ ہمیں اس چیز کو سمجھ لینا چاہئے کہ انسانی قوت اور توانائی کو اگر ضائع کیا جاتا رہا تو معاشرہ اس قدر پسماندہ ہوتا چلا جائے گا۔ آج معاشرہ میں کام کے کلچر کو پیدا کرنے کی بڑی ضرورت ہے۔ کیونکہ جب تک فرد کو یہ احساس نہ ہو کہ وہ اس معاشرے کے لئے مفید ہے اس وقت تک اس میں خود اعتمادی اور اپنی عزت کے احساسات پیدا نہیں ہوتے اور جب کام کا کلچر پیدا ہو جائے گا تو اس صورت میں جاگیردار، پیر یا عہدیدار جو کہ بغیر کام کے دوسروں کی محنت پر گزارا کرتے ہیں ان کی معاشرے میں کوئی عزت نہیں رہے گی اور یہ تمام لوگ معاشرے پر بوجھ بن جائیں گے۔

تاریخ گواہ ہے کہ معاشرے کی اصلاح کے لئے انقلاب کے علاوہ اور کوئی طریقہ کامیاب نہیں ہوتا۔ ہر شعبہ ہائے زندگی میں یعنی علمی، اخلاقی، فکری، ثقافتی، معاشرتی اور معاشی شعبوں میں انقلابی اصول و قوانین اپنانے کی ضرورت ہے۔ غریب اور امیر طبقہ کے درمیان بڑھتے ہوئے فاصلے سیاسی و مذہبی قیادتیں، تنگ نظر لوگوں کے ہاتھوں میں ہونے کی وجہ سے جرائم کی شرح میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے۔ غربت اور معاشی بدحالی کے سبب یا بالائی طبقے کی بڑھتی ہوئی دولت کی حوس، دولت اور طاقت کا جنون قوم کی رہی سہی کثر پوری کر دے گا۔ اور آج ملک میں ہر طرف ذہنی انتشار اور افراتفری کا یہ عمل عام ہے۔ کہ ہر فرد اپنی محرومیوں کا ذمہ دار دوسروں کو گردانتا ہے۔ دنیا کے کسی بھی حصے میں یہ صورتحال پیدا ہو جائے تو وہاں انقلاب کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ پھر ایسی سحر طلوع ہوتی ہے جو اس قوم کے نام نہاد راہنماؤں کی جہالت و فساد اور ظلم و ستم کے خاتمے اور عدل و انصاف کی خوشخبری لئے ہوئے ہوتی ہے۔

☆☆☆☆☆

لالہ لعل بخش رند کی یاد میں تعزیتی جلسہ

عابد شکیل فاروقی

ہم لعل بخش رند کی اپنے نظریہ سے وابستگی، انقلابی زندگی اور انتھک جدوجہد کو سلام پیش کرتے ہیں انکے افکار و کردار ہمارے لئے مشعل راہ ہیں

ورکرز پارٹی پاکستان کے مرکزی رہنماء اور مشہور مارکسی دانشور جناب لال بخش رند کی یاد میں ایک تعزیتی جلسہ مورخہ یکم اکتوبر 2010ء بروز جمعہ آرٹس کونسل پاکستان، کراچی میں منعقد ہوا، جس میں مقررین نے سیاسی نظریات سے مضبوط وابستگی اور بنیادی سماجی تبدیلی کے لئے عملی جدوجہد پر انہیں خراج عقیدت پیش کیا۔

جلسے کی صدارت ورکرز پارٹی پاکستان کے مرکزی نائب صدر جناب یوسف مستی خان نے کی جس میں مرحوم کے ذاتی دوستوں کے علاوہ ان کے سیاسی و نظریاتی ساتھیوں نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔ جلسے سے درج ذیل رہنماؤں نے خطاب فرمایا:

بزرگ سیاسی رہنماء جناب معراج محمد خان، نیشنل پارٹی کے جناب بزن بزنجو، عوامی نیشنل پارٹی کے جناب امین خٹک، ورکرز پارٹی پاکستان کے مرکزی سیکرٹری جنرل جناب اختر حسین ایڈووکیٹ، ممتاز سیاسی رہنماء جناب منظور لچکی، ممتاز مزدور رہنماء محترمہ کنیز فاطمہ اور جناب منظور رضی، ممتاز دانشور جناب مسلم شمیم، جناب بی۔ایم۔ کٹی، لالہ کے دیرینہ ساتھی جناب نور محمد شیخ اور ممتاز صحافی حضرات جناب شاہد حسین، جناب لطیف بلوچ اور جناب سرور جاوید۔ ان کے علاوہ جناب نجم الحسن عطاء اور ندیم سبطین نے لال بخش رند کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔

مقررین نے لالہ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے انکی سیاسی عملی جدوجہد سے لے کر اپنے علاقے کے مسائل کے حوالے سے ان کی جدوجہد پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ اجلاس کی نظامت کے فرائض ورکرز پارٹی پاکستان کے سرگرم رہنماء جناب عمر بلوچ نے ادا کئے۔

جلسے کے پہلے مقرر جناب مسلم شمیم نے لالہ کے بارے میں کہا کہ اس تاریک عہد میں لال بخش رند کے رخصت ہونے سے ہمارا معاشرہ واقعی غریب تر ہو گیا ہے۔ ان کو خراج عقیدت پیش کرنے کا سب سے مناسب طریقہ یہی ہے کہ ہم انکے آدرش کو، ان کے مشن کو اور اس پرچم کو تھامے رہیں جس کے لئے لالہ نے زندگی گزاری، تمام عمر جدوجہد کی۔ لالہ ایک دانشور بھی تھے اور خود ادیب نہ ہونے کے باوجود ہماری سرپرستی کرتے تھے۔ عوامی ادبی انجمن اور انجمن ترقی پسند مصنفین سے ان کی گہری وابستگی انکی ادب دوستی کی ایک روشن مثال ہے۔

جناب منظور رضی نے اپنی گفتگو میں لال بخش رند کے بارے میں فرمایا کہ ہم نے کبھی بھی انہیں مایوس ہوتے ہوئے نہیں دیکھا وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ مزدوروں میں کام کو تیز تر کیا جائے۔ جب تک ان مزدوروں اور محنت کشوں کو متحرک نہیں کیا جائیگا اس ملک کے عوام کی حالت نہیں بدل سکتی۔ اس ملک سے بھوک، غربت اور جہالت کا خاتمہ ممکن نہیں ہو سکے گا۔ جلسے کے تیسرے مقرر روزنامہ دی نیوز کے جناب شاہد حسین تھے، انہوں نے کہا کہ لالہ سے ہمارا تعاف ہماری طالبعلمی کے دور سے ہوا اور اس وقت سے ہم نے انہیں نہایت شفیق انسان اور committed سیاسی کارکن پایا۔ انہوں نے نہ صرف لیاری کے نوجوانوں کو متاثر کیا بلکہ ملک کے دیگر سیاسی کارکنوں کو بھی اپنے سیاسی نظریات اور اپنی زندگی میں ان کے اطلاق سے حد درجہ متاثر کیا۔ جناب نور محمد شیخ نے اپنے تحریر شدہ مضمون میں لالہ کے حوالے سے ان کی ادب دوستی کا ذکر کیا اور اپنے مضمون کے ذریعے عوامی ادبی انجمن کی تشکیل میں لالہ کے کردار کا تفصیلی احاطہ کیا، جناب نور محمد شیخ کا مضمون علیحدہ سے شائع کیا جا رہا ہے۔ بعد ازاں روزنامہ ڈان سے وابستہ ممتاز صحافی جناب لطیف بلوچ نے لالہ کے حوالے سے اپنی یاداشتوں کو حاضرین کے سامنے پیش کیا۔ انہوں نے کہا کہ لالہ سے میری وابستگی 1965ء سے تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بلوچستان میں فوج کشی ہو رہی تھی، قوم پرستی کی لہر اپنے عروج پر تھی۔ یورپ کے کئی خطوں میں مزدور جدوجہد اور قوم پرستی کی تحاریک کی ہلچل تھی، اور ایسے ماحول میں ہم کالج کے طالب علم فاشزم اور نیشنل ازم کی باتیں کرتے تھے۔ اسی دوران ہماری لالہ سے ملاقات ہوئی جن سے مل کر ہم بین الاقوامی سیاسی تحریکوں کے پس منظر اور ان کے بارے میں شعور اور نظریاتی آگہی حاصل کرتے تھے۔ لالہ وہ شخصیت تھے جن سے مل کر کتنے ہی نوجوانوں نے سیاسی اور نظریاتی حوالوں سے رہنمائی حاصل کی۔

عوامی نیشنل پارٹی کے جناب امین خٹک نے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ لالہ بند کمروں کی سیاست کے قائل نہیں تھے، وہ عملی جدوجہد پر یقین رکھتے تھے۔ آج لالہ ہمارے درمیان جسمانی طور پر موجود نہیں ہیں لیکن ان کی جلائی ہوئی مشعلیں طبقاتی جدوجہد اور قومی سوال پر جدوجہد کرنے والوں کو روشنی دیتی رہیں گی۔ ممتاز شاعر اور صحافی جناب سرور میر نے کہا کہ لال بخش رند ان چند شخصیات میں سے تھے جو اس سیاست کا اور ملک کی سیاست کا پورا شعور رکھتے تھے۔ جن کے ہاں فکر کی سچائی واضح طور پر ملتی تھی۔ وہ اس معاشرے کی نفسیات کو سمجھتے تھے۔ قومی سوال پر بھی انکی سوچ نہایت واضح تھی اور وہ اس کا اظہار بڑی آسانی سے کرتے تھے۔ میں جب بھی کوئی سیاسی تجزیہ چاہتا لالہ سے ہمیں انتہائی آسانی سے حاصل ہو جاتا تھا۔ میں ان کے پاس نہایت آسانی سے پہنچ سکتا تھا۔ وہ ایک غیر متنازع شخصیت کے مالک تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ سیاسی شعور کا ایک عملی نمونہ تھے۔ ایسی شخصیات جب ہمارے درمیان میں سے ہٹ جاتی ہیں تو ہمیں اپنی کم مائیگی کا بڑی شدت سے احساس ہوتا ہے۔ آج اگر ہمیں انہیں خراج عقیدت پیش کرنا ہے تو ہمیں چاہئے کہ دوبارہ اپنی صفوں کو آراستہ کریں اور دوبارہ انہی راستوں پر چلیں جنکی نشاندہی لال بخش رند نے اپنی زندگی میں نہایت واضح طور پر کی۔

اس موقع پر ممتاز دانشور اور سیاستداں جناب بی۔ایم۔ کٹی نے لالہ لال بخش رند کی سیاسی فکر اور جدوجہد کو بھرپور خراج عقیدت پیش کیا اپنے تحریر شدہ انگریزی مضمون میں انہوں نے کہا کہ لالہ کا مارکسی نظریات پر یقین غیر متزلزل تھا اور اسی نظریاتی پختگی کی وجہ سے وہ ہمیشہ پسماندہ و محروم قومیتوں اور طبقات کے برابر معاشی، سیاسی اور سماجی حقوق کے لئے

جدوجہد کرتے رہے۔

ممتاز سیاسی رہنماء جناب منظور گچکی نے لالہ کے حوالے سے اپنی گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ وہ اپنا نقطۂ نظر واضح طور پر رکھتے تھے۔ وہ کبھی کسی سے مرعوب نہیں ہوتے تھے چاہے وہ اسٹیٹ ہو یا کوئی بہت بڑی شخصیت۔ انہوں نے کہا کہ بیشک لالہ ایک بہت بڑے انسان تھے لیکن وہ ایک بلوچ تھے وہ ایک بلوچ قوم پرست تھے جو کسی بھی دوسری قوم کے غریب و لاچار اور محنت کش کا دکھ بھی اتنی ہی شدت سے محسوس کرتے تھے جتنا ایک بلوچ کا۔ میں نے آج تک کسی کی زبان سے لالہ کے بارے میں کوئی غلط حرف نہیں سنا۔ انہوں نے لالہ کی زندگی کے ایک اور رخ کے بارے میں بھی حاضرین کو آگاہ کیا۔ انہوں نے بتایا کہ لالہ ایک باکسر، دانشور، سیاسی ورکر و نظریاتی شعور کا ایک روشن مینار کے ساتھ ساتھ ایک فلم ایکٹر بھی تھے، جن کا بہت کم لوگوں کو علم ہوگا۔ وہ خود تو ادیب نہ تھے لیکن ادب دوست ضرور تھے۔ وہ اپنے سے زیادہ اپنے دوستوں کا خیال رکھتے تھے۔ انہوں نے نہ صرف اپنی ذات کی قربانیاں دیں بلکہ اپنے نظریات کی خاطر اپنے گھر کی بھی قربانی دی۔

جلسے سے خطاب کرتے ہوئے ورکرز پارٹی کے جنرل سیکرٹری جناب اختر حسین ایڈووکیٹ نے کہا کہ بہت مشکل ہوتا ہے ایسے کسی ساتھی کے بارے میں بات کرنا جس کے ساتھ زندگی کے ہر مشکل وقت میں ہر قسم کے حالات میں کندھے سے کندھا ملا کر چلے ہوں۔ ہر قسم کی صورتحال کا خندہ پیشانی کے ساتھ مقابلہ کیا ہو۔ لالہ بہت شفیق اور دوستوں سے محبت کرنے والے شخص تھے۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ لالہ اپنے نظریات اور سیاسی طرز عمل میں انتہائی سخت بھی تھے۔ وہ سیاسی عملی میدان میں انتہائی نظم وضبط کے پابند رہنماء تھے اور دوسروں سے بھی اس کی توقع رکھتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ہم اس وقت تک اپنی عملی سیاست اور جدوجہد کا کوئی نتیجہ حاصل نہیں کر سکتے جب تک ہم میں ہر ایک اپنے نظریئے، اپنی سیاست اور اپنے مقاصد کے بارے میں ذہنی طور پر واضح نہ ہو، اپنے کاز سے committed نہ ہو اور اس کے لئے ہمیں از خود اپنے اوپر کچھ پابندیاں لاگو کرنی پڑیں گے۔ اس لئے وہ ہمیں زندگی بھر اپنے نظریے سے وابستہ سیاسی کارکن نظر آئے۔ ان کی وابستگی تھی مارکسزم سے، محنت کار عوام کی جدوجہد سے اور انسانوں کی زندگی کو بدلنے سے۔ انہیں فخر تھا اپنے بلوچ ہونے پر لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ قومی برابری کی جدوجہد سے بھی اسی حد تک وابستہ تھے اور جب کسی قوم کے معاشی سیاسی حقوق کی بات ہوتی تھی تو لالہ کہتے تھے کہ ہم یہ حقوق اس قوم کے لوگوں کے لئے مانگ رہے ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ قومی حقوق کی جدوجہد کو طبقاتی حقوق کی جدوجہد سے جوڑنے ہی سے کسی قوم کا حقیقی تشخص تشکیل پاتا ہے اس لئے ہمارے نقطۂ نظر سے کسی قوم کی حقیقی جدوجہد انکی زندگیوں کو بدلنے کی جدوجہد ہے اور وہ کامیاب نہیں ہوتی جب تک اس قوم کے حکمراں طبقات سے حقیقی آزادی حاصل نہیں ہو جاتی۔ لالہ کہتے تھے کہ صوبائی خودمختاری اور قومی حقوق، اور قومی برابری کی جدوجہد میں فرق ہے، صوبائی خودمختاری کی جدوجہد بھی ضروری ہے اور وہ ہم کرتے رہیں گے مگر قومی برابری کی اصل جنگ کسی قوم کے لئے معاشی وسائل پر قبضے کی جنگ ہے، کیونکہ جب تک کسی قوم کی اپنے معاشی وسائل پر قدرت نہیں ہوگی اس وقت تک اس قوم کی حقیقی ترقی، سیاسی ترقی، تہذیبی ترقی ممکن نہیں ہوسکتی۔ اختر صاحب نے اپنی گفتگو میں ملک کی تشکیل سے لے کر آج تک مختلف سول اور فوجی حکمرانوں کی اس ملک کی آئینی اساس کے بارے میں کج فہمیوں اور مفاد پرستانہ تشریحات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ لالہ کی جدوجہد کا ایک دوسرا پہلو ایک سیکولر اسٹیٹ کی تشکیل کے لئے جدوجہد بھی تھا جس میں اس ملک کے شہریوں کے شہری، سیاسی، معاشی وقومی حقوق کے ساتھ ساتھ ان کی مذہبی آزادیوں کے حق کی بھی ضمانت دی گئی ہو۔ جناب اختر صاحب کی تفصیلی گفتگو کے بعد ممتاز مزدور رہنماء محترمہ کنیز فاطمہ کو دعوت خطاب دی گئی۔ انہوں نے کہا کہ آج لیاری کے نوجوان اور اس ملک کے نوجوان اگر لالہ سے اپنی قربت اور محبت کا دعویٰ کرتے ہیں تو انہیں چاہئے کہ وہ ان کے مشن کو آگے لے کر چلیں۔

جلسے کے اگلے مقرر بزرگ سیاسی رہنماء جناب معراج محمد خان تھے جنہوں نے کہا کہ اگر لال بخش رند سیاست کے عروج کے دور میں اپنے نظریات پر کسی بھی قسم کا کوئی سمجھوتہ کرنا چاہتے تو اس کے لئے سیڑھیاں بہت تھیں، راستے بھی بہت تھے لیکن اس کی اپنے نظریے اور پارٹی سے وابستگی تھی۔ اگر وہ اس وقت سمجھوتہ کر لیتے تو آج اس کا نام بھی ملک کے بہت بڑے بڑے اور نامور سیاست دانوں میں شمار ہوتا۔ وہ ایک فقیر منش اور درویش صفت انسان تھے جو تمام عمر لیاری میں جئے اور لیاری ہی میں اپنی جان دے دی۔ لالہ کہتے تھے کہ ہمیں گول مول باتوں کی بجائے صاف ستھری سیاست کرنی چاہئے۔ ان کی ہمیشہ کوشش رہی کہ اگر اس ملک میں ایک اچھا سیاسی combination بن جائے تو یہ ملک چل سکتا ہے۔ اس میں ایک جمہوری انقلاب برپا کیا جا سکتا ہے۔ وہ قومی آزادی کے ایک سچے علمبردار تھے۔ اگر آپ انہیں یاد رکھنا چاہتے ہیں، انہیں زندہ رکھنا چاہتے ہیں تو لوگوں میں سیاسی شعور بیدار کرنا ہوگا، گماشتہ سرمایہ داری اور جاگیرداری کے خلاف علم بغاوت بلند کرنا ہوگا۔

نیشنل پارٹی کے جناب بزن بزنجو نے لال بخش رند سے اپنے تعلقات پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ وہ لالہ کو اپنا دوست نہیں اپنا استاد سمجھتے تھے۔ انہوں نے طلباء سیاست کے دور میں کھل کر ہماری سرپرستی کی۔ کراچی میں سرگرم بلوچ طالبعلموں کو ٹھکانہ فراہم کیا۔ جناب بزنجو نے کہا کہ میں ان کے عزم کا پجاری تھا اور آخر تک رہا کیونکہ میں نے انکا یہ عزم بستر علالت پر بھی دیکھا۔ میں اس لال بخش رند کو سلام پیش کرتا ہوں۔

جلسے کے آخری مقرر جناب یوسف مستی خان تھے جنہوں نے اپنی صدارتی تقریر میں لالہ کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ وہ اپنی ذات میں انقلاب کی ایک مکمل کتاب تھے۔ انہوں نے پاکستان کے اندر ہمیشہ مظلوم قومیت اور طبقات کی جدوجہد کی جوڑنے کی کوشش کی۔ وہ سمجھتے تھے کہ جب تک مظلوم قومیت اور مظلوم طبقات کی جدوجہد ساتھ ساتھ نہیں چلے گی اس وقت تک اس ملک میں کوئی تبدیلی نہیں آ سکتی۔ انکی اپنے نظریے سے commitment اس قدر مضبوط تھی کہ جب سوویت یونین کے بکھرنے کے بعد سوشلزم اور کمیونزم کے نام نہاد بڑے بڑے عالموں نے کہا کہ اب نظر ثانی کی ضرورت ہے، اور مارکسزم سے روگردانی کرنے لگے لیکن لال بخش رند مرتے دم تک اسی کمٹمنٹ کے ساتھ ڈٹا رہا۔ لالہ نے بلوچ قومیت کو، بلوچ کلچر کو پوری دنیا میں روشناس کرایا۔ لال بخش رند بلوچوں کی آزادی امریکہ کے پرچم تلے نہیں دیکھنا چاہتے تھے، وہ بلوچوں کی آزادی سامراج مخالف

کیمپ کے اندر رہ کر دیکھنا چاہتے تھے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ اگر ہم سب ساتھی لالہ کو خراج تحسین پیش کرنے یہاں جمع ہوئے ہیں اور ہم سمجھتے ہیں کہ انکی تحریک صحیح سمت میں تھی تو ہمیں ملکر آج یہاں ایک بنیادی تبدیلی کی طرف قدم بڑھانا ہوگا جو ہمیں انقلاب کی منزل پر پہنچا کر دم لے۔آج ہمارے ملک کی سیاسی و معاشی ابتری ہم سے ایک انقلاب کا تقاضہ کر رہی ہے۔ جناب یوسف مستی خان کی تقریر کے بعد جلسے کے اختتام کا اعلان کیا گیا۔

تعزیتی پیغامات

جناب عابد حسن منٹو صدر ورکرز پارٹی پاکستان، نعیم شاکر ڈپٹی سیکرٹری جنرل ورکرز پارٹی پاکستان، عثمان بلوچ آرگنائزر سندھ ورکرز پارٹی، بابر ایاز ممتاز دانشور و صحافی بیرون ملک ہونے اور ممتاز دانشور، شاعر و صحافی واحد بشیر اور ورکرز پارٹی اور انجمن ترقی پسند خواتین کی راہنماء اقبال سلطانہ علالت کی وجہ سے لالہ لال بخش رند کے یکم اکتوبر 2010ء منعقدہ آرٹس کونسل پاکستان کے تعزیتی اجلاس میں شریک نہ ہو سکے۔انہوں نے ٹیلیفون پر اپنی اپنی طرف سے تعزیتی پیغامات دیئے جن کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

''لالہ لال بخش رند نے اپنی زندگی ایک سچے مارکسسٹ اور انقلابی کی حیثیت سے گزاری۔ ان کی پوری زندگی نوجوانی سے انتقال تک بھرپور جدوجہد کی زندگی تھی۔ وہ شعوری طور پر پاکستان کے جاگیرداروں وقبائلی معاشی و سماجی ڈھانچے کو بدلنے اور ایک نئے ترقی پسند سماج کے قیام کی جدوجہد کرتے رہے۔ انہوں نے اپنی سیاست کی بنیاد سماجی طور پر پسماندہ طبقات کو بنیاد بنایا اور ہمیشہ ان سے عملی جدوجہد میں رشتہ قائم رکھا۔اس جدوجہد میں انہوں نے قید و بند، ریاستی تشدد، ملک بدری اور طویل بیماری کا بھی بہادری سے مقابلہ کیا اور کبھی مایوس نہیں ہوئے۔ وہ ہمارے ملک میں قومی و طبقاتی حقوق اور سماجی تبدیلی کی جدوجہد کا بہت بڑا ورثہ تھے اور ہمیں اس ورثے پر فخر ہے۔ہم اپنے ساتھیوں اور خاص کر نوجوانوں سے اپیل کرتے ہیں کہ لالہ کی زندگی اور جدوجہد کو مشعل راہ بنائیں اور یہی انہیں خراج عقیدت پیش کرنے کا طریقہ ہے۔''

''بابائے لیاری'' لالہ لال بخش رند

ندیم سبطین

نہ اک دو کا وہ سب کا تھا
جو کوکھ لیاری چمکا تھا

جو سب زخموں کا مرہم تھا
وہ رندوں کا رند انم تھا

اس آگ کی اپنی مستی تھی
جو پہروں پہر برستی تھی

بھر پور جو اک جام جم تھا
وہ رندوں کا رند انم تھا

چٹان تھا جو طوفانوں میں
اک ابر تھا ریگستانوں میں

جو اپنی ذات کُل عالم تھا
وہ رندوں کا رند انم تھا

لہجے میں اس کے نرمی تھی
ہر فیصلے میں پر گرمی تھی

وہ تیز تھا اور کچھ مدھم تھا
وہ رندوں کا رند انم تھا

مایوسی کفر کا درجہ ہے
وہ فکرِ انقلاب میں زندہ ہے

جو کہتا ہمیشہ ہی ہم تھا
وہ رندوں کا رند انم تھا

لالہ لعل بخش رند کی ادب دوستی

نور محمد شیخ

لالہ لال بخش رند کی حیات اور جدوجہد کا جلی پہلو نظریاتی اور عملی سیاست تھا۔ لیکن ان کی زندگی کا خفی پہلو مطالعہ ادب اور ادب دوستی تھا۔ وہ اپنی بے پناہ سیاسی مصروفیتوں کے درمیان مطالعہ ادب کے لئے وقت نکال لیتے تھے۔ ان سے ملنے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ وہ کتاب یا رسالہ پڑھتے ہوئے ذہنی طور پر کسی سیاسی کارکن ساتھی کی آمد کے منتظر رہتے تھے۔ اگر کوئی آجاتا تو کتاب یا رسالے کو نشان کے ساتھ رکھ دیتے تھے۔ وہ اگر سیاستدان نہ ہوتے تو یقیناً ایک بہت اچھے قلم کار ہوتے۔ ابتداء میں انہوں نے لکھا تھا۔ بلوچستان کی تاریخ پر اور پھر بلوچی زبان کی تعلیم کے ابتدائی مدارج کے قاعدے یا ابتدائی کتابیں مرتب و شائع کیں۔ انہوں نے اپنے دوست اور بلوچی زبان کے نامور شاعر میر گل خان نصیر کے شعری مجموعے شائع کئے۔ اور انہوں نے یہ مجموعے بلوچستان اور کراچی کے لوگوں کے ہاتھوں تک پہنچائے۔ جنرل ایوب خان کے مارشل لائی اور آمرانہ دور میں لالہ رند کا یہ کارنامہ اسٹیبلشمنٹ کے لئے قطعاً گوارا نہ تھا۔

عوامی ادبی انجمن کے قیام میں، لالہ کا کردار ایک مخلص کارکن کا سا تھا۔ منشور پر دستخط لینے کے لئے وہ کئی بلوچی و براہوی ادیبوں اور شاعروں سے ملے۔ انہوں نے عوامی ادبی انجمن کے قیام کے تقاضے سمجھائے اور ان سے دستخط لئے۔ عوامی ادبی انجمن کے قیام کے دنوں میں سنہ 1967 اور 1968ء میں حاجی عبداللہ ہارون کالج میں ان کی آمد کا سلسلہ مستقل تھا۔ کبھی اکیلے، اکثر گل خان نصیر کے ساتھ۔ فیض احمد فیض جو ہارون کالج کے پرنسپل تھے۔ ان سے ملنے اور ڈاکٹر محمد رکن الدین حسان سے ملاقات کرنے، جو ہارون کالج کے وائس پرنسپل تھے۔

عوامی ادبی انجمن کا قیام عمل میں آیا تو اگر وہ شہر میں ہوتے اور پولیس کو مطلوب نہ ہوتے تو ضرور شرکت کرتے تھے۔ نشست میں تنقید کے لئے پیش کی جانے والی تخلیقات کو توجہ سے سنتے تھے اور اکابرین ادب کی تنقیدی آرا کو غور و انہماک سے سنتے تھے۔ وہ اپنی رائے پیش کرنے میں صبر سے کام لیتے تھے اور پھر صدرِ نشست کے کہنے پر یا خود ہی اپنی رائے کا اظہار کرتے۔ ان کی تنقیدی رائے میں عقلی یا معروضی پہلو ہوتا تھا۔ وہ کسی تخلیق میں انسانی سماج کی سچائیوں کے فنکارانہ بیان کے پہلو کو اہمیت دیتے تھے۔ ان کی تنقید مارکسی یا سماجی ادبی تنقید کا نمونہ ہوتی تھی۔

انہوں نے میر گل خان نصیر کے ایک شعری مجموعے ''حونِ ءِ گوانک'' مع اردو ترجمہ ''لہو کی پکار'' اور نصیر پر دو سوانحی کتابیں شائع کرنے میں عوامی ادبی انجمن کے ساتھ بھرپور تعاون کیا۔ اور ان کی زبردست حوصلہ افزائی ہی سے ڈاکٹر حسان کا کتابچہ ''پاکستان میں اردو کا مسئلہ، ایک نقطۂ نظر'' سندھی میں ترجمہ کر کے شائع کیا گیا۔

ہارون کالج میں ان کی آمد اور فیض صاحب اور ڈاکٹر حسان سے ان کی گفتگو، سیاست کے علاوہ ادب کے موضوع پر ہوتی تھی۔ پروفیسر مجتبیٰ حسین سے ان کی دوستی تھی۔ کراچی میں بھی ملاقاتیں رہتی تھیں۔ اور جب وہ ادارۂ ثقافت پاکستان، بلوچستان چیپٹر کے ڈائریکٹر ہوئے تو پروفیسر مجتبیٰ حسین سے ان کی ملاقاتیں تواتر سے ہونے لگیں تھیں۔ اور مجتبیٰ حسین سے انہوں نے ادب کے حوالے سے بہت سیکھا۔ سید سبط حسن سے بھی ان کی دوستی تھی۔ ان کی کتابیں پڑھنے کے بعد مختلف سوالات کی تشفی کے لئے وہ سبط حسن سے گفتگو کرتے تھے۔ خود ڈاکٹر حسان سے بھی ترقی پسند ادب کے مسائل پر سوالات و بحث کا سلسلہ رہتا تھا۔ ڈاکٹر حسان ایک مارکسی نظریہ دان ہونے کے علاوہ ایک شاعر، افسانہ نگار، مضمون نگار اور نقدِ ادب کے بہترین نباض تھے۔

شہر میں کہیں کتابوں کی نمائش کا اعلان ہوتا تو کسی دوست ساتھی کے ساتھ وہاں پہنچ جاتے اور ڈھیر ساری ترقی پسند ادب کی کتابیں خرید لاتے۔ روسی کلاسک تو سارا ان کا پڑھا ہوا تھا۔ جو سابق سوویت یونین سے اردو ترجمے کی صورت میں شائع ہوتی تھیں۔

وہ اپنی سیاسی تنظیم میں کسی کارکن میں ادب دوستی کی خوبی یا کچھ لکھنے کا سلیقہ یا صلاحیت پاتے تو اس کی حوصلہ افزائی کرتے۔ ادب کے علاوہ موسیقی سے بھی ان کا خاص لگاؤ تھا۔ مقامی بلوچ موسیقاروں اور گلوکاروں سے ان کی مخلصانہ دوستیاں تھیں۔ وہ ان کا حوصلہ بڑھاتے اور تخلیقِ فن کی نئی راہیں سجھاتے۔ انہوں نے میر گل خان نصیر کے کلام کا نمائندہ حصہ فنِ موسیقی سے آراستہ کیا اور کئی آڈیو کیسیٹس تیار کرائیں۔

لالہ لال بخش رند بلوچی کے معتبر زبان دان تھے۔ بلوچی زبان کے جملہ لہجوں پر ان کو دسترس تھی۔ براہوی زبان سے بھی بہ خوبی آشنا تھے۔ وہ اردو زبان کی اظہاری طاقت کے قائل اور اردو میں تخلیق شدہ بے پناہ و مؤثر و خوبصورت شاعری کے دلدادہ تھے۔ فیض صاحب، ساحر لدھیانوی، مجاز لکھنوی اور مخدوم محی الدین کی شاعری پڑھتے رہتے تھے۔ کرشن چند کے افسانوں میں محنت کشوں کی زندگی کے رنگ اور ان کا اندازِ بیان لالہ کو بہت بھاتا تھا۔

فنونِ لطیفہ اور خاص طور پر ادب سے گہری دلچسپی ہی کے سبب ان کا دل ایک محبت کرنے والے حساس فن کار کا دل تھا۔

لالہ لال بخش رند اپنے دوست پروفیسر مجتبیٰ حسین کے ان خیالات کو جو ان کی کتاب ''ادب و آگہی'' میں درج ہیں۔ ادب دوستوں اور ادیبوں کے لئے مشعل راہ سمجھتے تھے:

''اچھا ادب باشعور ہوتا ہے اور تلقین نہیں کرتا۔ وہ انسانی زندگی کے پیچ و خم اور جذبات و افکار سے ہمیں ہم آہنگ کرتا ہے۔ وہ انسانی دکھ سکھ، آرزوؤں اور امنگوں، کامیابیوں اور ناکامیوں، عزائم اور حوصلوں کی جیتی جاگتی تصویر ہوتا ہے۔ ایسا ادب معاشرے کی جو فضا پیدا کرتا ہے وہ ہمارے لئے اجنبی اور نامانوس نہیں ہوتی۔ ہم اس معاشرے کی فضا میں سانس لینے لگتے ہیں۔ اس میں چلنے پھرنے والے افراد کی طرح غم اور خوشی محسوس کرتے ہیں۔ زندہ رہنے کے لئے جدوجہد کرتے ہیں۔ اچھی چیز کو قبول کرتے ہیں۔ بری چیز کو رد کرتے ہیں۔ ادب کی کامیابی اس میں ہے کہ وہ ہمیں ایسے عالم میں لے جاتا ہے جہاں ہم بغیر کسی دوسرے شخص کی ہدایت تلقین اور نصیحت کے معاشرے کے تمام حسن و قبح کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے ہیں۔''

اور وہ خود بھی ان ہی لفظوں کو ساری عمر اپنا ادبی منشور

بنائے رہے۔ ترقی پسند ادب کے لئے ان کی ایک یہ کاوش بھی یاد رہے گی کہ انہوں نے، عوامی ادبی انجمن کی لیاری اور رنچھوڑ لین میں شاخیں قائم کیں۔ رحیم بخش آزاد اور ناصر خان فرید کی حوصلہ افزائی کی۔ لیاری شاخ کے معتمد آزاد تھے اور ناصر خان فرید رنچھوڑ لین شاخ کے۔ ان دو شاخوں کے علاوہ ملتان اور گلگت، بلتستان میں بھی عوامی ادبی انجمن کی شاخیں قائم کرائیں۔

آج لالہ لال بخش رند مرحوم کو ادبی برادری میں جاننے والے کم رہ گئے ہیں۔ بلوچستان میں قبلہ عبداللہ جان جمالدینی اور شاہ محمد مری، لاہور میں محترم عابد حسن منٹو اور اپنی دھرتی پر اردو کے ادیبوں میں واحد بشیر، انور احسن صدیقی، سرور جاوید، مسلم شمیم، بابر ایاز اور شاہد حسین سندھی کے لکھنے والوں میں رؤف نظامانی اور جان خاصخیلی، بلوچی کے ادیبوں میں جی۔ آر۔ ملا، رحیم بخش آزاد، عابد آسکانی اور صبا دشتیاری ہیں۔

لالہ کے ساتھ کے لوگوں میں خالد علیگ، پروفیسر مجتبیٰ حسین، سید سبط حسن، مجیب خیر آبادی، میر گل خان نصیر، صادق مدہوش، رؤف شیرازی، عنایت کاشمیری اسطوری، ڈاکٹر شمس سومرو، فصیح الدین سالار، نجمہ بابر، فیض صاحب اور ڈاکٹر حسان کب کے دنیا چھوڑ چکے ہیں۔

مخدوم محی الدین کے اس شعر پر میں اپنی بات مکمل کرتا ہوں۔

ہر دم ترے انفاس کی گرمی کا گماں ہے
ہر یاد تری یاد کے پھولوں سے بسی ہے

میرے رند، مرے رہنما۔۔۔کامریڈ لال بخش رند کی یاد میں

سنو! میرے رند، مرے رہنما
اپنے تاریخ کے سرد ملبے کی پرچھائیوں میں کھڑے
چلو آج یادِ جنوں ہی منائیں
کہ جس کے لئے سولیوں کے سفر پر روانہ ہوئے
جہاں رہ گزر، رہ گزر
دشمن جاں، عدو و عشق کے
ناصحوں کا ہجوم تماشائیاں
کالے محبس کے در کھولتا ہی رہا
کب ملی میرے رند!
تیرے ہونٹوں کو ہر ذائقے کی زباں
ہم نئی کربلا کے مسافر ہمیشہ کی مانند چلتے رہے
اشک بہتے رہے
زخم کھاتے رہے
خون جلتا رہا
دل سلگتا رہا
مگر میرے رند! مرے رہنما
اس سے پہلے ہی کیا کم تھی بارانِ سنگ
اور اس پر کھلا میری مظلوم بستی کے دروازے پر
تیرے جانے کے روشن لہو کا علم
لہو جس کے ذروں میں دنیا بدلنے کا جوش
روشنی ولولوں کا انوکھا خروش
ناگہاں تھم گیا ولولوں کا سفر
رو پڑا آسماں پر قمر
چاندنی صفِ ماتم ہوئی
رات بڑھتی رہی
قید خانوں کی رونق بھی بڑھتی رہی
زخم کھلتے رہے
مفلسی بین کرتی رہی
پھر بھی رند تیرے روشن لہو کا علم
کارواں درد کا لے کر چلتا رہے گا، کراں تا کراں
سوئے منزل جہاں
اپنے در والم کے پرانے نشاں
تیرے گل زار خوابوں کی تعبیر میں
سارے مٹ جائیں گے ناگہاں

(یکم اکتوبر 2010 کو تعزیتی اجلاس میں پڑھی گئی)

نجم الحسن عطاء

لالہ لعل بخش رند۔ بلوچستان کا ایک قدآور سوشلسٹ راہنما

اسلم رحیل مرزا

حریت پسند عوام کی سرزمین بلوچستان کے ایک اولوالعزم سوشلسٹ بلوچ راہنما لالہ لال بخش رند گزشتہ دنوں کراچی میں چند سال کی شدید علالت کے بعد آخر داعیٔ اجل کو لبیک کہہ کر اپنے یاران ہم سفر، رفیقوں اور عزیزوں سے بچھڑ گئے۔ وفات کے وقت انکی عمر 80 سال کے لگ بھگ تھی۔ انہوں نے پاکستان کی تاریخ میں سچی عوامی جمہوریت کے قیام کے لئے مارشل لائی حکومتوں اور فوجی آمروں کے سیاہ دور میں بھی اپنی غیر مصالحانہ جدوجہد ہمیشہ جاری رکھی اور اس مقصد کے لئے وہ بلوچستان کے صف اوّل کے عوامی اور انقلابی اور قومی راہنماؤں خان عبدالصمد خاں اچکزئی، میر غوث بخش بزنجو، عطاء اللہ مینگل، میر گل خاں نصیر، سردار خیر بخش مری اور شیروف وغیرہ کے انقلابی گروپوں اور سیاسی جماعتوں کے ساتھ مل کر آزادی کے مختلف محاذوں پر امن، آزادی، جمہوریت اور سوشلزم کے لئے بڑی مستقل مزاجی سے جہد آزما رہے۔

وہ 1932 کو کراچی کے علاقہ لیاری میں وہاں ایک عرصہ سے آباد بلوچستان کے ایک رند خاندان میں لی مارکیٹ کے محلّہ جونا کمہار واڑہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام موسیٰ بنی بخش رند تھا۔ لہٰذا انہوں نے لیاری کے اس بلوچ علاقے میں ہی پرورش پائی اور وہیں ایک مقامی سکول میں میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ اپنی نوعمری کے زمانے سے ہی انہیں عوام کی آزادی و خودمختاری کی سیاست سے لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ اس لئے وہ اپنے طالب علمی کے دور سے ہی بلوچستان کے آزادی پسند طلباء کی فعال تنظیم بی۔ایس۔او۔ میں شامل ہو کے کام کرنے لگے تھے۔ بعدازاں انہوں نے اپنی باقاعدہ سیاسی زندگی کا آغاز میر غوث بخش بزنجو کے ساتھ کام کرتے ہوئے پہلے پاکستان نیشنل پارٹی میں شامل ہو کر 1956ء سے کیا اور پھر 1957ء میں جب میاں افتخار الدین مرحوم کی آزاد پاکستان پارٹی، خیبر پختون خواہ سے خان عبدالغفار مرحوم کی خدائی خدمتگار (سرخ پوش) پارٹی، سندھ سے جی ایم سید کی سندھ متحدہ محاذ اور مشرقی پاکستان سے حسین شہید سہروردی کی عوامی لیگ کے ادغام کے بعد ایک ملک گیر سیاسی پارٹی ''نیشنل عوامی پارٹی'' کے نام سے معرض وجود میں آ گئی تو وہ پاکستان کی اس عوام دوست اور سامراج دشمن پارٹی میں شامل ہو کر مولانا عبدالحمید بھاشانی کی راہنمائی میں بڑی سرگرمی سے کام کرنے لگے مگر بعدازاں نیشنل عوامی پارٹی پر جنرل ایوب خان کی مارشل لائی حکومت کے برسراقتدار آنے پر جب نیپ پر ریاستی پابندی لگا دی گئی تو پہلے وہ شیر باز مزاری کی بنائی گئی ''نیشنل ڈیموکریٹک'' میں شامل ہوئے مگر جب یہ پارٹی بھی زیادہ عرصہ نہ قائم رہ سکی تو وہ میر غوث بخش بزنجو کی تشکیل دی گئی ''پاکستان نیشنل پارٹی'' میں شامل ہو کر کام کرنے لگے۔ مگر اس کھلے عام کام کرنے والی عوامی پارٹی کو بھی کام کرنے کا موقع نہ دیا گیا تو اس صبر آزما دور میں پھر وہ کراچی اور سندھ میں امام علی نازش مرحوم کی انڈر گراؤنڈ یعنی زیرزمین رہ کر کام کرنے والی ''کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان'' میں لیاری کے ایک اور سوشلسٹ بلوچ راہنما یار محمد مرحوم کے ساتھ شامل ہو کر بھی کام کرتے رہے۔

تاہم نازش مرحوم کی سربراہی میں روپوش ہو کر کام کرنے والی کمیونسٹ پارٹی کے طریق کار اور اس کی بھٹو نواز پالیسیوں کی وجہ سے جب اس پارٹی سے ان کا نظریاتی اختلاف پیدا ہو گیا تو وہ اس پارٹی کے ایک اور ممتاز راہنما محمد رکن الدین حسان اور ان کے کچھ ساتھیوں کے ساتھ اس پارٹی سے الگ ہو گئے اور پھر م۔ر۔ حسان کی تشکیل دی گئی پارٹی ''کمیونسٹ لیگ آف پاکستان'' میں شامل ہو کر بھی ''کمیونسٹ پارٹی'' کے انڈر گراؤنڈ طریق کار پر گامزن ہو کر کام کرنے لگے اور پھر م۔ر۔ حسان کی وفات کے بعد 1985ء میں ''کمیونسٹ لیگ آف پاکستان'' کے جنرل سیکرٹری بھی بنا دیئے گئے مگر اس پارٹی میں رہ کر زیرزمین طریقوں سے کام کرتے ہوئے جب وہ اپنی سامراج دشمن عوامی سیاست کو آگے نہ بڑھا سکے تو پھر ''کمیونسٹ لیگ'' کو ''سوشلسٹ پارٹی آف پاکستان'' میں ضم کر کے ختم کر دیا گیا تو وہ کراچی کے سوشلسٹ راہنما انیس ہاشمی کے ساتھ مل کر سی۔آر۔ اسلم کی راہنمائی میں کام کرنے لگے۔ آخر میں جب سوشلسٹ پارٹی اور عابد حسن منٹو کی سربراہی میں قائم کی گئی ''ورکرز پارٹی'' کے ادغام کے بعد جب ''نیشنل ورکرز پارٹی'' معرض وجود میں آئی تو وہ اس میں بھی شامل رہے اور پھر ''نیشنل ورکرز پارٹی'' اور کمیونسٹ مزدور کسان پارٹی کے انضمام کے بعد جب دوبارہ ایک نئی ''ورکرز پارٹی پاکستان'' عابد حسن منٹو کی سربراہی میں قائم کی گئی تو وہ اس میں بھی شامل رہے اور اپنی آخری عمر میں اپنی علالت اور معذوری کے باوجود اس پارٹی کی مجلس عاملہ کے ایک سینئر ممبر کی حیثیت سے اپنی وفات کے وقت تک شامل رہ کر کام کرتے رہے۔

لالہ لال بخش رند کو اپنی طالب علمی کے زمانے سے ترقی پسند ادب اور سوشلزم کے مسائل پر مشتمل علوم کے مطالعہ کا ہمیشہ بہت ذوق وشوق رہا جبکہ تاریخ اور فلسفے کے مضامین ان کے پسندیدہ موضوعات تھے اور اپنی مادری بلوچی زبان کے علاوہ وہ براہوی، سندھی، پشتو، سرائیکی اور پنجابی یعنی پاکستان کی مقامی زبانوں کے علاوہ اردو بھی خوب جانتے تھے۔ انگریزی زبان کی بھی وہ اچھی خاصی سُدھ بُدھ رکھتے تھے۔ جبکہ مارکسزم، لیننزم اور سوشلزم کے علوم سے تو انہیں گہری وابستگی تھی۔ وہ اپنی سیاسی و نظریاتی زندگی کے آغاز سے ہی عوامی سیاست سے وابستہ رہ کر پاکستان کی متعدد بائیں بازو کی ترقی پسند اور عوام دوست نظریاتی پارٹیوں میں یکے بعد دیگرے شامل ہو کر کام کرتے ہوئے پاکستان میں عوامی و ترقی پسند سیاست کے مقاصد کو آگے بڑھانے کے لئے زندگی بھر جہد آزما رہے۔ مگر وہ شروع سے ہی سیکولر سیاست کے حامی تھے۔ لہٰذا ہر قسم کی فرقہ پرستی سے الگ تھلگ رہ کر ہمیشہ عوام کی فلاح و بہبود کی عوامی سیاست سے وابستہ رہے اور زندگی میں ملا ازم کی سیاست کا شکار ہو کر بھی مذہبی جنون کو پھیلانے والی جماعتوں کے قریب تک نہ گئے بلکہ اس کے برعکس وہ وسیع ترین عوامی و قومی مفادات کے تحفظ کے لئے ہمیشہ سامراج دشمن اور عوام دوست سیاست کے قائل تھے۔ اس لئے وہ بائیں بازو کی جس جماعت میں بھی شامل ہوئے وہاں رہ کر ہمیشہ عوام کی حاکمیت، جمہوریت اور سوشلزم کی آبیاری کے لئے بڑی سنجیدگی اور لگن سے جدوجہد کرتے رہے اور اسی پاداش میں کئی بار جیل بھی گئے۔ ان سیاسی جماعتوں میں کام کرنے کے علاوہ وہ اکثر و بیشتر سماجی و اصلاحی تنظیموں اور تہذیبی سرگرمیوں میں بھی بڑی سرگرمی سے حصہ لیتے رہے اور اس اعتبار سے وہ لا محالہ کراچی کے مزدور بستیوں اور لیاری کے بلوچ علاقے میں رہنے والے باشندوں اور سیاسی کارکنوں کے نہ صرف راہنما تھے بلکہ بلوچستان کی عوامی سیاست کے روح رواں بھی تھے۔ جبکہ سوشلزم انکا نصب العین تھا۔

جسے حقیر سمجھ کر بجھا دیا تم نے
وہی چراغ جلیں گے تو روشنی ہوگی

ساؤتھ ایشین پیپلز فورم کے زیر اہتمام بریڈفورڈ یو کے میں ڈاکٹر ایوب مرزا کا تعزیتی ریفرنس

بریڈفورڈ۔ ساؤتھ ایشین پیپلز فورم یو۔کے۔ کے زیر اہتمام معروف معالج، ترقی پسند مصنف، سوانح نگار اور دانشور ڈاکٹر ایوب مرزا کا تعزیتی ریفرنس زیر صدارت راحت سعید ڈپٹی سیکرٹری انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان منعقد ہوا۔ تقریب کی نظامت کے فرائض پرویز فتح نے سرانجام دیئے۔

راحت سعید نے ڈاکٹر ایوب مرزا کی ادبی اور سیاسی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ ترقی پسند سیاست و ادب سے مرحوم کی وابستگی اتنی مستحکم تھی کہ زمانہ طالب علمی سے لے کر ساری زندگی کے دوران انہوں نے کبھی بھی کسی موقع پر مصلحت کی راہ اپنانے کی بجائے قید و بند کی صعوبتوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنا پسند کیا۔ ان کی تصنیفات جن میں معروف انقلابی اور ٹریڈ یونین راہنماء دادا امیر حیدر کی سوانح، ان کی اپنی خودنوشت سوانح، فیض نامہ اور ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی'' شامل ہیں، جنوبی ایشیاء کے سیاسی ادب کی شاہکار کتب مانی جاتی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ڈاکٹر ایوب مرزا کا شمار ہمارے صف اول کے مارکس وادی راہنماؤں میں ہوتا ہے اور ان کی رحلت سے جنوبی ایشیاء کی ترقی پسند تحریک کو نا قابل تلافی نقصان پہنچا ہے جس کی تلافی تحریک میں نوجوان نسل کی بھرپور شرکت ہی سے ہوسکتی ہے۔

پروفیسر نذیر تبسم نے تقریب کے آغاز میں خطاب کرتے ہوئے کہا کہ آج ہم سب ڈاکٹر ایوب مرزا کو اپنے درمیان نہ پا کر سوگوار ہیں۔ ڈاکٹر ایوب مرزا سے ہمارا وہی تعلق ہے جو مرحوم ڈاکٹر صاحب کو فیض صاحب سے تھا اور وہ تعلق سرمائے اور محنت کے تضاد کے باعث پیدا ہونے والی سماجی اور معاشی ناہمواریوں کا شکار محنت کش طبقات کے ساتھ اپنی شناخت کا تعلق ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے دکھوں کی بجائے دنیا کے دکھوں کو اپنانے کو ترجیح دیتے تھے۔ لوگوں کے جسمانی عوارض کا علاج کرنے کے ساتھ ساتھ وہ معاشرے کے دبے کچلے افراد کے معاشی اور سماجی عوارض کو بھی زندگی بھر مداوا کرتے رہے۔ فیض صاحب کے کلام اور ڈاکٹر ایوب مرزا کی زندگی بھر کی جدوجہد سے سیاست و معیشت کا عنصر اگر خارج کر دیا جائے تو باقی کچھ نہیں ملے گا۔ فیض اور ڈاکٹر ایوب مرزا کا کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان سے انضباطی حد تک وابستہ ہونا واقعاتی حقیقت ہے جسے جھٹلایا نہیں جاسکتا۔

مرحوم کے صاحبزادے ڈاکٹر امجد ایوب مرزا نے والد کے انتقال کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ''مجھے یوں لگا آج میرا والد نہیں میرا مرشد اس جہان سے رخصت ہوگیا ہے''۔ انہوں نے کہا کہ ان کے والد زندگی میں ترتیب قائم رکھنے کے شدت سے قائل تھے اور اس سلسلہ میں اولاد کے ساتھ ان کا رویہ ایک سخت گیر والد کا سا تھا۔ 1977ء کے ضیائی مارشل لاء کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا جب نومبر 1977ء میں انہیں بھی گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا گیا تو روزنامہ مساوات نے سرخی جمائی ''پاک چین فرینڈ شپ ایسوسی ایشن کے چیئرمین ڈاکٹر ایوب مرزا کے بیٹے امجد مرزا کو بھی دھر لیا گیا'' تو اس خبر کی اشاعت کے فوراً بعد چینی سفیر اور مشرقی یورپی ممالک کے متعدد سفیر میرے والد سے اظہار ہمدردی کے لئے ہمارے گھر آئے، ہر ایک نے میرے والد کو پیش کش کی وہ ان کے بیٹے کو اپنے ملک میں حصول تعلیم کے لئے لے جائیں گے۔ لیکن میری رہائی کے بعد میرے والد نے مجھے طب کی تعلیم کے لئے چین بھیجنے کو ترجیح دی۔

ڈاکٹر ایوب مرزا کی بیٹی ڈاکٹر علینا مرزا نے تقریب سے خطاب کے دوران بتایا کہ ان کا گھر ادبی اور سیاسی سرگرمیوں کا مرکز و محور ہوا کرتا تھا جہاں والد کے ترقی پسند شاعر و ادیب دوست بلا روک ٹوک آتے جاتے تھے اور فیض چچا کو تو ہمارے گھر کا فرد مان لیا گیا تھا۔ اور ان کے قیام کے دوران دیگر شاعروں اور ادیبوں کی آمدورفت کے تواتر میں کچھ زیادہ ہی اضافہ ہوجاتا تھا۔

تقریب میں شرکت کی غرض سے لندن سے تشریف لانے والے عاصم شاہ اور اکرم قائمخانی نے مرحوم ڈاکٹر صاحب کو زبردست الفاظ میں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ اگرچہ وہ مرحوم کے شریک سفر تو نہ تھے، تاہم وہ ان کے شریک منزل ضرور ہیں۔

مانچسٹر کے انیس زیدی نے کہا کہ ڈاکٹر ایوب مرزا کی زندگی کی جدوجہد کے تذکرے سے ہماری آگے کی راہیں منور ہوتی ہیں اور ہمیں راستے کی مشکلات کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنے کا حوصلہ ملتا ہے۔

ساؤتھ ایشین پیپلز فورم کے کوآرڈینیٹر سرون سنگھ نے کہا کہ ہمیں اپنی نوجوان نسل کو ترقی پسندانہ نظریات و عمل سے لیس کرنے کی بڑی ضرورت ہے۔

نظامت کے فرائض انجام دینے کے دوران وقفوں وقفوں سے پرویز فتح مرحوم ڈاکٹر صاحب کی زندگی کے اوراق پلٹتے رہے، ان سے اپنے نظریاتی تعلق اور انقلاب چین کی روشنی میں پاکستان کے کسانوں کی تحریک کو منظم کرنے کی ضرورت کے پیش نظر اپنے والد اور بزرگ و معمر کمیونسٹ راہنماء چوہدری فتح محمد، عابد حسن منٹو، شیر علی باچا، میجر اسحاق محمد، افضل بنگش اور غلام نبی کلو سے تعلقات کے استوار ہونے کے واقعات سناتے رہے۔

Unite for Palestine کے راہنماء مختار علی نے کہا کہ ہمیں ایسی تقریبات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے نوجوانوں کے لئے تخلیقی ادب کی تربیتی ورکشاپس کا اہتمام کرنا چاہئے۔

معروف شاعر بوٹا خان راجس، شاعر، ادیب اور نقاد ڈاکٹر احمد مختار اور بلند پایہ شاعر جاوید اقبال ستار نے کہا کہ ڈاکٹر ایوب مرزا نہ صرف بہت اچھے انسان تھے بلکہ وہ بلند درجہ انسانیت دوست بھی تھے۔

خالد سعید قریشی، جمخانہ کلب کے خواجہ وحید اور ٹریڈ یونین راہنماء لالہ محمد یونس نے کہا کہ مرحوم ڈاکٹر صاحب کسی ایک علاقے کے نہیں بلکہ ساری انسانیت کے لئے مینارہ نور کی حیثیت رکھتے تھے۔ مرحوم ڈاکٹر ایوب مرزا کے کمسن پوتے علائبی نے اپنے دادا کو بڑے معصومانہ انداز میں یاد کیا۔

اجلاس کے دوران معروف شاعر اور ادیب جناب محسن اقبال کے انتقال پر ملال پر ایک قرارداد تعزیت کے ذریعے ان کی شاعرانہ اور سماجی اور معاشی ناہمواریوں کا شکار محنت کش طبقات کے ساتھ تعلق اور ترقی پسند سیاست و ادب کے ساتھ مرحوم کی وابستگی کا اعتراف کرتے ہوئے زبردست الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا اور ان کے پسماندگان سے اظہار ہمدردی کیا گیا۔ تقریب کے دوران ہال شرکاء سے کھچا کھچ بھرا رہا اور بعض حضرات کو دو گھنٹے تک کھڑا رہنا پڑا جس پر منتظمین نے اظہار معذرت کیا۔

انٹرنیشنل ایسوسی ایشن آف ڈیموکریٹک لائرز کے اجلاس میں

پاکستان کے سیلاب زدگان کی امداد اور پاکستان کے قرضوں کے لئے عالمی برادری اور عالمی مالیاتی اداروں سے اپیل کر دی

منیلا: ڈیموکریٹک وکلاء کی عالمی تنظیم IADL نے ایشیاء پیسیفک کے وکلاء کی پانچویں کانفرنس کا اہتمام فلپائن کے دارالخلافہ منیلا میں 17-16 ستمبر 2010ء کو کیا جس میں پاکستان کے سینئر وکلاء الیاس خان، شوکت حیات، مسعود غنی اور معین اظہر صدیقی نے اختر حسین جو ورکرز پارٹی پاکستان کے سیکرٹری جنرل بھی ہیں کی قیادت میں شرکت کی۔ اجلاس میں عالمی صورت حال، انسانی حقوق کی پامالی اور دیگر اہم ایشوز پر غور فکر کے بعد متعدد قراردادیں منظور کی گئیں۔ (جن کو آئندہ شمارہ عوامی جمہوریت میں شائع کیا جائے گا)۔

اجلاس میں خصوصی طور پر پاکستان کے سیلاب زدگان سے ہمدردی کا اظہار کیا گیا اور عالمی برادری سے ان کے لئے امداد کی اپیل کی گئی۔ اجلاس میں پاکستان میں سیلاب جیسی قدرتی آفت جس کے نتیجہ میں ہزاروں انسانی جانوں، جانوروں، فصلوں اور املاک کی تباہی کے پیش نظر معیشت پر نہایت بُرے اثرات کے پیش نظر IADL نے عالمی مالیاتی اداروں سے اپیل کی کہ وہ پاکستان کو دیئے گئے قرضے معاف کر دیں۔

قرارداد کا متن حسب ذیل ہے:

''IADL کے بیورو کے ممبران پاکستان کے عوام اور خاص طور پر 20 ملین کے قریب سیلاب سے متاثرین کے ساتھ ہمدری اور یکجہتی کا اظہار کرتے ہیں جو اس وقت سیلاب کی تباہ کاریوں سے نبرد آزما ہیں۔ ہمیں نہایت دکھ ہے کہ اس قدرتی آفت کے نتیجہ میں سینکڑوں دیہات، قصبے اور شہر سیلاب کے پانی میں ڈوب گئے جس میں ہزاروں انسانی جانیں تلف، جانور ہلاک، فصلیں تباہ اور کھربوں کی مالیت کی املاک سیلاب کی نظر ہوگئیں۔ متاثرین کے فوری مسائل میں خوراک، پانی، ادویات، کپڑے اور رہنے سہنے کے لئے چھت فراہم کرنا ہیں جبکہ بڑا مسئلہ جو ملک کو درپیش ہے وہ ان لاکھوں متاثرین کی زندگی کو دوبارہ معمول پر لانا ہے جس کے لئے قومی سطح پر مناسب پالیسی ترتیب دینا ہوگا۔

پاکستان جیسے کمزور ملک کے لئے نہایت مشکل کام ہوگا کہ وہ ان گھمبیر مسائل کو آسانی سے حل کر لے، لہٰذا ہم عالمی برادری اور عالمی فلاحی اداروں سے اپیل کرتے ہیں کہ فراخدلی سے متاثرین کی امداد کے لئے سامنے آئیں اور اس مشکل گھڑی میں سیلاب زدگان اور پاکستان کی حکومت کے لئے دستِ تعاون بڑھائیں۔

اس صورت حال کے پس منظر میں عالمی مالیاتی اداروں بشمول ورلڈ بنک، آئی۔ایم۔ایف۔ اور ایشین ڈویلپمنٹ بنک کو چاہئے کہ پاکستان کو دیئے گئے قرضے ختم کر دیں کیونکہ پاکستان کی معیشت اس قدرتی آفت کی وجہ سے تباہ ہوگئی ہے۔ اگر حکومت پاکستان نے قرضوں کے ختم ہونے کا موقف اختیار کیا تو IADL عالمی سطح پر ہر فورم میں پاکستان کی بھرپور حمایت کرے گی۔

☆☆☆☆☆

کامریڈ اللہ وسایا کے لئے تعزیتی اجلاس

ورکرز پارٹی پاکستان لودھراں کے ضلعی دفتر میں ایک تعزیتی اجلاس زیر صدارت چوہدری عبدالطیف مغل منعقد ہوا جس میں علاقے کی معروف سیاسی وسماجی شخصیت کامریڈ ملک اللہ وسایا کی ناگہانی وفات پر اظہارِ افسوس کیا گیا۔

مرحوم ورکرز پارٹی پاکستان کے ضلعی نائب صدر ملک الٰہی بخش کے سسر تھے اور کامریڈ ملک سعید اطہر کے والد تھے۔

مرحوم کی سیاسی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے جنرل سیکرٹری ورکرز پارٹی پاکستان لودھراں مہر وقار حسین نے کہا کہ مرحوم نے ہمیشہ اصولوں پر مبنی سیاست اور بائیں بازو کے نظریات کی خاطر عملی جدوجہد کی وہ ایک جدت پسند مثالی کاشتکار تھے جنہوں نے زراعت کے شعبہ میں بھی نمایاں خدمات سرانجام دیں۔

آخر میں مرحوم کے لئے دعائے مغفرت کی گئی اور پسماندگان کے ساتھ اظہار ہمدردی کیا گیا۔ اجلاس میں حکیم عمر حیات چنیوٹی، چوہدری ارشاد احمد، سید اختر محمود شاہ، شفیق الماس، طارق انجم، ملک نذیر احمد، ملک غلام مصطفیٰ، حاجی مشتاق حسین زرگر، ملک اسلم شاہد، ملک منظور احمد تھہیم نے شرکت کی۔

☆☆☆☆☆

تعزیتی اجلاس کے مقررین

CPL NO. 279

MONTHLY AWAMI JAMHURIAT
October, 2010 LAHORE

تعزیتی اجلاس کے شرکاء

ماہنامہ عوامی جمہوریت 5۔میکلوڈ روڈ، لاہور فون 042-37357091